ادب لطیف
نظم و غزل نمبر

نہ وقت کا زیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت
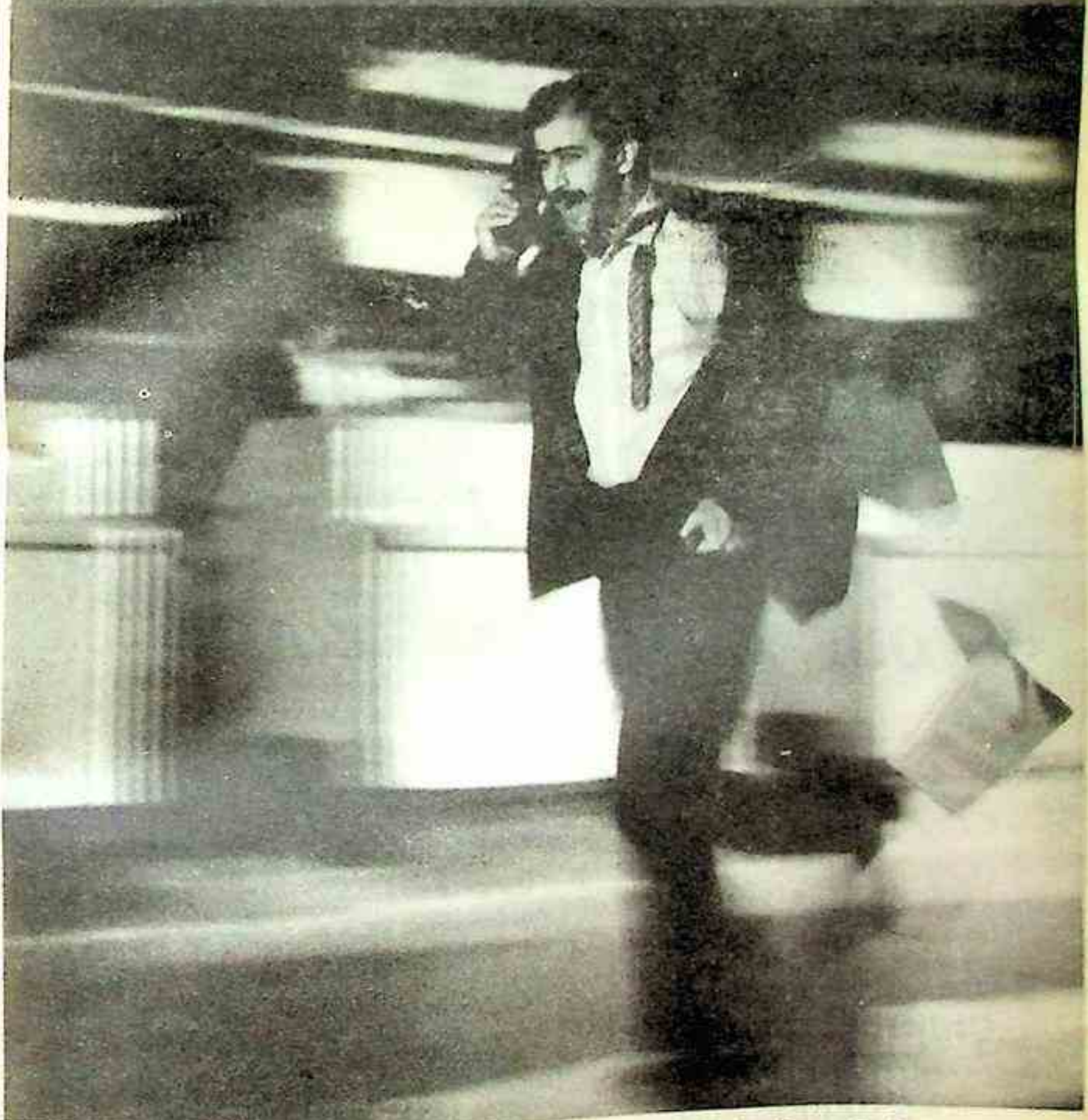
منظور شدہ برائے مدارس کراچی پاکستان بموجب سرکلر نمبر 54 / 53556 آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر
مظفر آباد بموجب سرکلر نمبر 18858 / 18811 مورخہ 1968-12-4

1935ء سے باقاعدہ شائع ہونے والا جریدہ

ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور

نظم و غزل نمبر

مینجنگ ایڈیٹر : افتخار علی چودھری
چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم
ایڈیٹرز : ظفر علی چودھری
محمد خالد چودھری
ایڈیٹر (اعزازی) : نوید مرزا
آرٹ ایڈیٹر : آغا نثار

بانی : چودھری برکت علی

جلد نمبر: 60 شمارہ نمبر: 3 مارچ 1995
قیمت : 60/- روپے

ناشر : افتخار علی چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس لاہور

زرِ سالانہ
پاکستان میں : 240/= روپے عام ڈاک سے
پاکستان میں : 300/= روپے رجسٹری ڈاک سے

33 - سی 3 - گلبرگ 3 ـــ لاہور (زپ کوڈ : 54660)
فون : 5761917
ذیلی دفتر : اکرم بلڈنگ - دربار مارکیٹ - لاہور
☎ 7115767

MONTHLY ADAB-E-LATIF LAHORE. Regd. No. L3521

ماہنامہ ادب لطیف کے خاص نمبر

گولڈن جوبلی نمبر
باتصویر + عام ایڈیشن
صفحات: 576
قیمت: 120 روپے

فیض نمبر
باتصویر + عام ایڈیشن
صفحات: 368
قیمت: 250 روپے

سالنامہ 88ء
لائبریری ایڈیشن
صفحات: 616
قیمت: 300 روپے

پچپن سالہ نمبر
لائبریری ایڈیشن + باتصویر
صفحات: 576
قیمت: 275 روپے

عصمت چغتائی نمبر
صفحات: 128
قیمت: 30 روپے

سالنامہ 94ء
صفحات: 240
قیمت: 60 روپے
عام ایڈیشن

ملنے کا پتہ:- 33 - سی 3 - گلبرگ 3، لاہور - 11
فون: 5761917

فہرست

غزل، فطرہ عباس سید، غلام حسین ساجد، غلام محمد قاصر، فضا ابن فیضی، فیاض فتح پوری، قائم نقوی، قاضی حسن رضا، قتیل شفائی، قمر سنبھلی، قیوم طاہر، قیوم مروت، ڈاکٹر کوثر محمود، کلیم ظفر، گفتار خیالی، گلنار آفریں، گوہر ہوشیار پوری، محسن ...سان، محسن بھوپالی، محسن زیدی، محشر بدایونی، محمد احمد رمز، محمد اصغر سلیم، محمد اطہر مسعود، محمد شہزاد بٹ، محمد مختار علی، محمد مجیب ...مر، محمد مشتاق آثم، محمد ممتاز راشد، محمد وحید انصاری، محمد یونس آفریدی، محیط اسماعیل، مختار اجمیری، مرتضیٰ برلاس، ...حو، مضطر، مظہر بخاری، مظہر بھوپالی، منظر ایوبی، مظفر حنفی، مقبول ستنوی، مقصود وفا، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، منیر الزمان منیر، ڈاکٹر ناصر الاسلام، منیر بھلی، منیر نیازی، ناصر بشیر، ناصر زیدی، ناصر شہزاد، نجیب احمد، ندیم شعیب، نثار اکبر آبادی، نواز شاہد، نور بجنوری، نورین طلعت عروبہ، نوید صادق، نوید مرزا، نعمان شوق، نینا جوگن، واجد امیر، وحید احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، وسیم صدیقی، وقار مانوی، یاسمین کنول، یونس نشاط

نظمیں

169 تا 259

آغا محمد سعید، آغا نثار، احمد صغیر صدیقی، اختر ضیائی، اسرار زیدی، اسلم رحیل میرزا، اسلم کولسری، اشرف سلیم، ڈاکٹر اشرف ...یل، اطہر عظیم، اظہار شاہین، اظہر جاوید، اعجاز احمد ثاقب، اعجاز رضوی، ارشد لطیف، اصغر شاہیا، افتخار شفیع، ڈاکٹر افضل ملک، اقبال ناظر، اکبر حمیدی، امجد علی شاکر، انوار فیروز، انیس انصاری، اوپندر ناتھ اشک، باقر مہدی، بختیار احمد، ...ش لائلپوری، بشیر اعجاز، بشیر رحمانی، بیدل حیدری، بیناگوئندی، تبسم کاشمیری، تحسین فراقی، جاوید شاہین، جمشید آفاق، جیلانی کامران، حسن تنویر زیدی، حنیف ترین، خادم رزمی، خلیل احمد، رب نواز مائل، رخشندہ نوید، رفیق سندیلوی، زاہد حسن، ستار سید، ستیہ پال آنند، سجاد مرزا، سعد اللہ شاہ، سلیم کوثر، سید صفدر حسین جعفری، سید نثار حسین ہمدانی، سیدہ رابعہ نہاں، شاہد اسلام دانش، شاہین مفتی، شبنم رومانی، شہزاد احمد، شہناز مزمل، شفیق احمد، شفیقی سلیمی، ضرر وصفی، ضمیر اظہر، طارق جاوید، عابد خورشید، عادل فریدی، عابد ودود، عارف ایوبی، عامر سہیل، عارف پرویز نقیب، عرفانہ عزیز، عزیز اعجاز، عشرت رومانی، عظمیٰ فاروقی، علقمہ شبلی، علی محمد فرشی، غافر شہزاد، غزل جعفری، غلام محمد قاصر، فرحت عباس شاہ، فرخ یار، قائم نقوی، کرامت بخاری، ڈاکٹر کوثر محمود، کلیم ظفر، گفتار خیالی، گوہر زیدی، محسن احسان، محمد افسر ساجد، محمد سلیم شہزاد، محمد مشتاق آثم، مقسط ندیم، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، میاں شان احمد، ناجیہ مبارک، ناصر زیدی، ناصر کریم، نسرین انجم بھٹی، نصیر احمد ناصر، نصیر الدین شیخ، نوید مرزا، نیناجوگن، وحید احمد، ڈاکٹر وزیر آغا

حصّہ غزل

آتش لکھنیاوی

اب ترے قرب میں میرا وہ گزارا تو نہیں
تو کسی اور کا ہے میرا سہارا تو نہیں

بے سبب چرخ کہن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
تیری زلفوں کو کبھی میں نے سنوارا تو نہیں

پھر مری فکر سخن سرخ ہوئی جاتی ہے
پھر کسی دست حنائی کا اشارہ تو نہیں

دل جو جلتا ہے جلے اور جلے بہتر ہے
اس کے جلنے میں کوئی اپنا خسارا تو نہیں

میں کسی رخ کے سیہ خال پہ کیا نذر کروں
مجھ کو حافظ کا سمرقند و بخارا تو نہیں

آگ ہی آگ ہے دریائے محبت آتش
تیرتے رہیے سدا اس میں کنارا تو نہیں

آثم فردوسی

دل ہیں سرد چٹانوں جیسے
چہرے ہیں انسانوں جیسے

آنکھیں تو آباد ہیں لیکن
منظر ہیں ویرانوں جیسے

صورت سے طفلک لگتا ہے
بولے بول سیانوں جیسے

سب عنوان سراسر فرضی
سب کردار فسانوں جیسے

دنیا ہے دنیا داروں کی
ہم تم ہیں مہمانوں جیسے

آثم ہیں میری بستی کے
باسی بند مکانوں جیسے

آشا پربھات

دیکھ کر اپنا گھر کیا کریں
ہم ہوئے چشم تر کیا کریں

آدمی کو بہ کو جا بہ جا
زندگی در بہ در کیا کریں

آندھیاں کچھ چلیں اس طرح
کھو گیا اپنا گھر کیا کریں

زندگی ڈھونڈتی ہے ہمیں
ہم بھی ہیں منتظر کیا کریں

اجنبی ہوگئے ہیں سبھی
لوٹ کر اپنے گھر کیا کریں

آصف ثاقب

بچھڑ جائیں جو ہم پھر سلسلے سارے ادھورے ہیں
سفر آدھے ہیں اپنے راستے سارے ادھورے ہیں

ہم اپنے دشمنوں کی عکس بندی کس طرح کرتے
نظر کی روشنی کے زاویئے سارے ادھورے ہیں

کوئی تحریر بھی پوری نہیں آتی عدالت سے
ہمارے منصفوں کے فیصلے سارے ادھورے ہیں

کہیں بھی عکس غم تکمیل کی صورت نہیں رکھتا
ہمیں پورے نہیں یا آئینے سارے ادھورے ہیں

کسی خاکے سے ان کی دوستی کھلنے نہیں پاتی
لکیریں سب ہیں مبہم دائرے سارے ادھورے ہیں

ہمارے آنسوؤں ، خوابوں کو منزل مل نہیں سکتی
سبھی نیندیں ہیں آدھی رت جگے سارے ادھورے ہیں

انا کے راستے پر ہم تو آگے آگئے ثاقب
ہمارے بعد ان کے قافلے سارے ادھورے ہیں

آصفہ طاہر

پاؤں وہ جس جگہ بھی دھرتا ہے
میرا آنچل وہیں بکھرتا ہے

رات کے پچھلے پہر پیار ترا
یاد کی سیڑھیاں اترتا ہے

جس طرح تم بدل گئے جاناں!
کوئی موسم بھی کیا بدلتا ہے

لب نہیں بولتے تو پھر کیا ہے!
دل ترے نام پر دھڑکتا ہے

اشک گرتے ہیں گہر بن بن کے
قطرہ قطرہ لہو ٹپکتا ہے

تلخیاں ہیں یہاں تا حد نظر
تیرا بادل کہاں برستا ہے

آصف نظیر

روشنی افکار کی دل میں اداسی بھر گئی
چاند کیا نکلا کہ سایوں سے حویلی بھر گئی

مل گئی تقدیر کو مٹھی میں کرنے کی سزا
آڑھی ترچھی کچھ لکیروں سے ہتھیلی بھر گئی

کیا اسی لمحے کو کہتے ہیں محبت کا عروج
آج میرے آنسوؤں سے آنکھ اس کی بھر گئی

بے ثمر خوابوں کے موسم اب نہ آئیں لوٹ کر
اب تو ایسے تجربوں سے زندگانی بھر گئی

غیر واضح ہی رہے آنکھوں میں دھندلے سے نقوش
مختلف اشکال سے دیوار ساری بھر گئی

روشنی اپنی گنوا کر وہ زمیں پر آگرے
جن ستاروں سے طبیعت آسماں کی بھر گئی

یوں تو سیدھی سی ہے جذبوں کی حکائت دوستو
کیفیت اس میں مگر افسانوی سی بھر گئی

آغا محمد سعید

یوسف ہوں نہ ہے کوئی بازار میسر
کیسے ہوں زلیخا سے خریدار میسر

دیوانگی لے آئی ہے دیکھو یہ کہاں پر
گھر ہے نہ کہیں سایہ دیوار میسر

دامن ہی الجھتا مگر ایسا بھی نہیں ہے
اس راہ میں کوئی بھی نہیں خار میسر

میں اپنا ہی سر پھوڑ کے مر جاتا کبھی کا
ہوتا جو مجھے سنگ در یار میسر

جس درد محبت سے ہو دل شاد ہمارا
وہ درد ہو یارو ہمیں سو بار میسر

اب کے بھی انا الحق کی صدا گونج رہی ہے
دیکھیں ہو کسے مرتبہ دار میسر

کچھ حال جنوں ہم بھی سعید اپنا دکھائیں
وحشت کو ہماری جو ہو بازار میسر

آغا نثار

یہی نہیں کہ فقط پیار کرنے آئے ہیں
ہم ایک عمر کا تاوان بھرنے آئے ہیں

ٹھٹھر نہ جائیں ہم اس عجز کی بلندی پر
ہم اپنی سطح سے نیچے اترنے آئے ہیں

وہ ایک رنگ مکمل ہو جس سے تیرا وجود
وہ رنگ ہم ترے خاکے میں بھرنے آئے ہیں

یہ بوند خون کی لوح کتاب رخ کے لئے
یہ تل سر لب رخسار دھرنے آئے ہیں

ترے لبوں کو ملی ہے شگفتگی دل کی
ہماری آنکھ کے حصے میں جھرنے آئے ہیں

لگا رہے ہیں ابھی خیمے غم کی وادی میں
ہم اس پہاڑ سے دامن کو بھرنے آئے ہیں

نثار بند قبا کھولنا محال نہ تھا
سو ہم جمال قبا بند کرنے آئے ہیں

آفاق انجم

توڑ کر رسمِ انا تجھ کو منانے آگئے
وقت کی دہلیز پر ہم سر جھکانے آگئے

پھر وہی منظر ٹھہرتا جارہا ہے آنکھ میں
پھر وہی تجھ سے بچھڑنے کے زمانے آگئے

چند لمحوں کے لیے جب بھی ملی فرصت مجھے
تیری یادوں کے کئی منظر سامنے آگئے

جب سے مجھکو ظلمت شب سے نکالا چاند نے
سینکڑوں تارے میرے گھر جگمگانے آگئے

درد کے مارے ہوئے جاناں یہ آخر کون ہیں
جو تری چاہت میں جنگل کو بسانے آگئے

میں تو اس کو بھول کر صحرا کی صورت تھا مگر
کون سے دکھ ہیں جو پھر انجم رلانے آگئے

ڈاکٹر آفتاب انجم

شیشۂ دل کانچ کے پیکر اچھالے جائیں گے
چبھتے ہیں جو آنکھ میں منظر اچھالے جائیں گے

پھر کھلائے جائیں گے جسموں پہ گل ہائے وفا
ہم سے دیوانوں پہ پھر پتھر اچھالے جائیں گے

ان بہاروں میں ہوئے ہیں جسم ہی زخمی مگر
اب کے آئی فصل گل تو سر اچھالے جائیں گے

پھر منایا جائے گا جشن تباہی دوستو
میکدے میں آج پھر ساغر اچھالے جائیں گے

شہر میں پھیلے گی اب خوشبو ہمارے پیار کی
اب ہمارے نام بھی گھر گھر اچھالے جائیں گے

شہ رگوں کی پیاس انجم آج پھر بڑھنے لگی
پھر گلوں کے واسطے خنجر اچھالے جائیں گے

آفتاب یاسر

کب اپنے اجالے کی قبا جاتا ہے ہم کو
بجھتے ہوئے لمحوں نے ہوا جاتا ہے ہم کو

اوروں کی دعا رد عمل سے رہی محفوظ
اب لے کے کوئی اپنی دعاجاتا ہے ہم کو

گو حکم ہے سولی کا بس اک سادہ ورق پر
الزام تو رنگین دیا جاتا ہے ہم کو

سورج ہیں مگر ہم سے بہت دور ہے دنیا
سو ایک ستارہ ہی گنا جاتا ہے ہم کو

یہ طے نہ ہوا تھا کہ ہم اندھے ہی رہیں گے
جس سمت چمک ہوگی چلا جاتاہے ہم کو

خود رو ہیں مگر موسمی حالات نے یاسر
تقلید کے گملے میں اگا جاتا ہے ہم کو

ابو سجاد ساغر

جب یہاں فتنہ نہ تھا رہبر نہ تھا
اس جگہ برپا کوئی محشر نہ تھا

اب تڑپتا ہے یہاں وہ رات دن
جو کسی بھی درد کا پیکر نہ تھا

تلملاتے ہیں وہاں سب آج کل
جس جگہ کوئی گلا اکثر نہ تھا

اس سے پہلے اس کا تکیہ یہاں
اس قدر آفات کا محور نہ تھا

چار سو شاخیں بریدہ ہیں پڑی
یوں گلستاں کا کبھی منظر نہ تھا

کون آوارہ نہ تھا اس دیس میں
کون تھا جواس جگہ بے گھر نہ تھا

کون تھا جو ہم فقیروں سا یہاں
چلچلاتی دھوپ کا خوگر نہ تھا

مے تو کافی تھی صراحی میں مگر
میکدے میں کوئی بھی ساغر نہ تھا

ابصار عبدالعلی

میں ٹوٹ پھوٹ سے گزرا ہوں، اور گزرتا ہوں
سمیٹنے جو چلوں اور بھی بکھرتا ہوں

میں مانگتا نہیں بارش بھی ہاتھ پھیلا کر
نہاؤں اپنے پسینہ میں تب نکھرتا ہوں

وہ ہاتھ تھام لے، روکے، مگر میں کیسے رکوں
مرا وجود سفر ہے، میں کب ٹھہرتا ہوں

سوالنامے بناتا ہوں بیٹھ کر خود ہی
تمام خانے جوابوں سے خود ہی بھرتا ہوں

کھلونے دیکھ کے بچپن کو لوٹ جاتا ہوں
میں بڑھ کے چھوتا نہیں، ٹوٹنے سے ڈرتا ہوں

تھا میرا وعدہ بیعت جو ہاتھ پر حق کے
وہ ہاتھ حق نہیں نکلا تو اب مکرتا ہوں

ستم ظریف ہوں کیسا یہ دیکھئے تو ذرا
اسی کو دیکھ کے جیتا ہوں جس پہ مرتا ہوں

میں بادشاہ تو ابصار کو بناتا ہوں
نہیں بنوں گا رعایا یہ عزم کرتا ہوں

فرش تک کمرے کا قاتل دھو گئے
حرف خوں کے اور اجلے ہو گئے

دیر کر دی آپ نے تعبیر میں
خواب آنکھوں میں ہی تھک کے سو گئے

ایک بیٹا کیا گیا اس گاؤں سے
دوسرے بھی پھر نہ لوٹے جو گئے

خار اگتے ہیں گلوں کے روپ میں
بیج کیسا بونے والے بو گئے

آئے تھے وہ میری سننے کے لئے
اور الٹا اپنا رونا رو گئے

پوچھنے پر یہ پتہ ان کا چلا
وہ، ابھی آئے تھے جو، وہ تو گئے

اپنے محور سے جدا ہونے کے بعد
کچھ نہ پایا اور خود بھی کھو گئے

احسان رانا

خشک موسم کو تصور میں برابر رکھنا
چشم نم ! کل کے لئے اشک بچا کر رکھنا

تم کہیں میری نگاہوں سے نہ ہو جاؤ غروب
بھیڑ میں گھر کے سدا ہاتھ اٹھا کر رکھنا

بھولتا ہی نہیں اس شوخ کا انداز بہار
میرے گلدان میں ہنس ہنس کے گل تر رکھنا

تو بھی کھا سکتا ہے ٹھوکر کبھی ہنگام سفر
ہے بری بات کسی راہ میں پتھر رکھنا

کیا جنوں ہے کہ سدا رہنا ہواؤں کے سپرد
خود بگولے کی طرح پاؤں میں چکر رکھنا

ہے تو فرسودہ مگر بات بڑے کام کی ہے
جب سنو شور سگاں ہاتھ میں پتھر رکھنا

وقت نے اس کے سوا اور دیا ہی کیا ہے
بے سبب دھوپ کا الزام شجر پر رکھنا

احسن عزیز

سب لے کے اپنی اپنی صلیبیں جدا ملے
چارہ گری کا دیکھیں کسے حوصلہ ملے

ہم کو ستم ظریفی قسمت سے کیا ملے
مانگے جسے بھی ٹوٹ کے، وہ نارسا ملے

اک آرزو میں ساری تمناؤں کا سراغ
اک زخم سے تمام غموں کا پتہ ملے

انصاف کا جہاں میں تصور کوئی نہ تھا
نہ جرم کی سزا، نہ وفا کا صلہ ملے

اتنے تعلقات سے اپنائیت کا غم
اتنا ہجوم، اور نہ کوئی آشنا ملے

مایوسی اور امید کی ہر لحظہ کشمکش
قسمت کے بند کھولتے جاتے ہیں، کیا ملے

آوارگی ہو ختم کہاں جانے دیکھئے
شہر صنم کا جانے کہاں سلسلہ ملے

احمد اصغر راجہ

بے نشان ہوگیا دھوپ اور دھول میں
زندگی کا حسن جو تھا مہکتے پھول میں

نعت یوں اترتی ہے دل پہ ان ؐ کی یاد میں
جس طرح سر حرا آیتیں نزول میں

ساعتوں کا خواب تھا روز و شب کا سلسلہ
عمر کا سکوں لٹا اک ذرا سی بھول میں

آئنوں میں ہو بہو خال و خد ملے ترے
روبرو ہے حسن کا عکس پھول پھول میں

آندھیوں نے وقت کی خال و خد بجھا دیئے
چھپ گیا وہ عکس بھی آئنے کی دھول میں

احمد راہی

میں دل زدہ ہوں اگر، دل فگار وہ بھی ہیں
کہ جرم عشق کے اب دعویدار وہ بھی ہیں

ہوا ہے جن کے کرم سے دل و نظر کا زیاں
بعض وقت مرے غم گسار وہ بھی ہیں

شہید جذبوں کی فہرست کیا مرتب ہو
شمار میں جو نہیں، بے شمار وہ بھی ہیں

دل تباہ ! یہ آثار ہیں قیامت کے
رہین گردش لیل و نہار وہ بھی ہیں

حریم حسن کی تزئین تھے جو پیکر ناز
بحال زار، سر راہگذر وہ بھی ہیں

سجائے پھرتے ہیں جسموں پہ جو گلوں کے لباس
چبھے ہوئے مرے پہلو میں خار وہ بھی ہیں

وہ جن سے عام ہوئی داستان اہل جنوں
ترے گنہ دل ناکردہ کار وہ بھی ہیں

احمد صغیر صدیقی

بدن میں آگ تو سوچوں میں ... جائے
بس ایک بار جو تو میرے ... ائے

بچا بچا کے نہ رکھ اپنے ... ت
دھرے دھرے نہ کہیں اس کو

کھڑے ہیں تیز ہوا میں خلا
ہمارے ہاتھ بھی کوئی پتنگ

پھر ایک بار اٹھی ہے سنگ سفر
نہ پھر غم در و دیوار سنگ لگ

جنوں میں حد سے گزرنے لگے ہیں دیوا...
عجب نہیں کہ انہیں فکر سنگ لگ جائے

پردہ خاک پہ ہر نقش بنانے سے بنا
ایک میں ہی تھا کچھ ایسا کہ مٹانے سے بنا

تن پہ آئی ہے ردا دھول کی کمخواب کے دام
یہ خرابہ دل پرخوں کے خزانے سے بنا

میں بھی بیزار رہا اس سے، اسی کے مانند
یعنی میرا وہ کسی اور بہانے سے بنا

اسے دینی ہی پڑی پھر مرے سر کی قیمت
سی مقتل کا سماں جب نہ زمانے سے بنا

... پہلے بھی زمیں تھی مگر ایسی کب تھی
... شہر سخن میرے ہی آنے سے بنا

اختر رومانی

پہلے یہ کشتی امید جلاؤں جاناں
پھر قدم اپنے کہیں اور بڑھاؤں جاناں

موت ملتی ہے یہاں زیست نہ پاؤں جاناں
کیا تجھے شہر کے حالات بتاؤں جاناں

کچھ اس ا.ا سے آفات نے گھیرا اکبے
کہیں گھبر تجھے بھول نہ جاؤں جاناں

ذہن و احسا حبس کا موسم طاری
سوچنا چاہوں نہ پاؤں جاناں

منزلیں راستے اور ہ ہی الگ
اب بتا کیسے ترا جاناں

یہ بصارت کا نہیں ' یہ تصور
دیکھنا چاہوں مگر دیکھ نہ

وجہ آبادی دل تھا ترا غم جو
اب کہاں سے میں اسے ڈھونڈکے لاؤں جا

اختر شاہجہاں پوری

جو شب کی سیاہی کو نگلنے کے لئے ہے
سورج وہ مرے جام میں ڈھلنے کے لئے ہے

شب خون کے آثار ہیں یلغار کی آہٹ
ایسے میں کوئی گھر سے نکلنے کے لئے ہے

مدت سے مری زندگی خاموش ہے جیسے
پیراہنِ صد چاک بدلنے کے لئے ہے

آنکھوں میں کرو قید ہر اک ساعت رنگیں
یہ منظرِ پر کیف بدلنے کے لئے ہے

معصوم فرشتے کے فقط لمس بدن سے
چشمہ کوئی صحرا میں ابلنے کے لئے ہے

پھر میں نے جلایا ہے دیا خون جگر سے
پھر راہِ وفا پر کوئی چلنے کے لئے ہے

یہ تجربہ کام آئے گا تیرے کبھی اختر
راہ کی ٹھوکر تو سنبھلنے کے لئے ہے

اختر شمار

خامشی لب پہ نگاہوں میں عقیدت رکھ لی
عشق کے در سے ملی جو بھی وہ نعمت رکھ لی

خود کو برباد کیا تیری محبت رکھ لی
مجھ سے بد حال نے بھی درد کی دولت رکھ لی

دل کے اوراق میں مہکی ہوئی کلیوں کی طرح
ایک اک یاد تری حسب ضرورت رکھ لی

آنکھ میں اشک بھی آنے نہ دیے محفل میں
دل نے چپ رہ کے ترے نام پہ عزت رکھ لی

ہم بھی پہنچے تھے تری دید کو در پر ترے
کچھ نہ پایا تو شمار آنکھ میں حسرت رکھ لی

اختر مرزا

اٹھائے پھر رہا ہوں بوجھ سر پر پھینکنے کو
یہاں کچھ بھی نہیں رکھا ہے اختر سوچنے کو

ابھی سالم ہے دیوار انا یا گر گئی ہے
ہمارے ساتھ چلتا ہے کوئی یہ دیکھنے کو

مجھے جس قید تنہائی میں رکھا جارہا ہے
وہاں کوئی نہیں آئے گا مجھ سے بولنے کو

زمیں اپنی کشش کھونے لگی ہے اور ہم بھی
سر ساحل گھروندوں کی طرح ہیں ٹوٹنے کو

اگر مجبور کرتا ہے ہمیں یہ اپنا ہونا
تو پھر یہ کشتی جاں بھی ہے اپنی ڈوبنے کو

جنوں کی خیر ہو راہ محبت میں کہ اس نے
مرے ترکش کے سارے تیر توڑے ہارنے کو

وہ اک نادیدہ قوت روکتی ہے اس لئے بھی
مسافت میں مرے رہرو ہیں تھک کر بیٹھنے کو

اختر ضیائی

خواب در خواب انتشار میں ہے
زندگی یاس کے غبار میں ہے

پھونک سکتی ہے سطوت دوراں
آگ وہ عشق کے شرار میں ہے

بے یقینی کے ابتلاء میں کہاں
غم کی لذت جو اعتبار میں ہے

کشت امید ایک مدت سے
موسم گل کے انتظار میں ہے

اضطراب نمو غنیمت ہے
موت کی بے حسی قرار میں ہے

اہل کردار خوب جانتے ہیں
فرق جو تخت اور دار میں ہے

بن کے ملا ہے ناصح مشفق
جو بھی شامل مزاج یار میں ہے

اس زمانے میں بھی وفا کا اسیر
دیکھ ہم . سا کوئی ہزار میں ہے

داد و تحسین اور تجھے اختر
شاعری میں تو کس شمار میں ہے

ادریس بابر

ایک نئی تقویم بسائی جاسکتی ہے
تنہائی مصرف میں لائی جاسکتی ہے

بچوں کی امید بندھائی جاسکتی ہے
شہزادی کی جان بچائی جاسکتی ہے !

اتنا سہل نہیں ہے ہم سے آنکھ ملانا
چاند ستاروں کی بینائی جاسکتی ہے !

باپ کے تخت کا تختہ کرنے والے بیٹے!
یہ تاریخ کبھی دھرائی جاسکتی ہے!

کیسے اس کے سحر سے نکلا جاسکتا ہے
کیسے ان سے آنکھ بچائی جاسکتی ہے!

کل ترتیب الٹ بھی تو سکتی ہے، بابر
بن بھی بیچ کے اپنا بھائی جاسکتی ہے!

اختر ہوشیار پوری

حرف بے آواز سے دہکا ہوا
اک دیا ہوں طاق میں جلتا ہوا

اس طرف دیوار کے بھی میں ہی تھا
اس طرف بھی میں ہی تھا بیٹھا ہوا

آنگنوں میں پھول تھے مہکے ہوئے
کھڑکیوں میں چاند تھا ٹھہرا ہوا

کورے کاغذ پر عجب تحریر تھی
پڑھتے پڑھتے میں جسے اندھا ہوا

کیا کہوں دست ہوا کے شعبدے
ریت پر اک نام تھا لکھا ہوا

میرے خوں کی گردشیں بھی بڑھ گئیں
اس قبا کا رنگ بھی گہرا ہوا

انگلیوں میں اس بدن کا لوچ ہے
رنگ و خوشبو کا سفر تازہ ہوا

رات بھر جس کی صدا آتی رہی
سوچتا ہوں وہ پرندہ کیا ہوا

جاگتی آنکھوں میں اختر عکس کیا
میں نے دیکھا قافلہ جاتا ہوا

اسلم کولسری

رات گئے جب ویرانے میں سلگائی بانسریا
میری آنکھیں اتنا برسیں ، گھبرائی بانسریا

دیوانی کوئلیا نے ، برہن کے آنسو بھر کر
پھر سے بھیگی ہوئی فضا میں بکھرائی بانسریا

کٹیا میں بوڑھے راگی نے مرنے سے کچھ پہلے
اپنی ہی پگڑی کی راکھ میں دفنائی بانسریا

رات ہزار بہار کے پورے جوبن کی ہو ، پھر بھی
سوکھے پتوں سے بھر ڈالے لے انگنائی بانسریا

یہ تصویریں البم کے خالی حصے میں ہوں گی
گاؤں ، چاندنی ، پنگھٹ ، برگد ، پروائی ، بانسریا

آتی جاتی سانسوں میں بھی اتنی آگ بھرلی ہے
ہر نیلے ہونٹوں سے چھو کر جھلسائی بانسریا

پہلی بار نہ جانے کس البیلے جادو گر نے
گم ، آوارہ ، مست سروں کو پہنائی بانسریا

اسلم آج مجھے کب ایک غزل کہنی تھی لیکن
میز پہ رکھی پنسل دیکھ کے یاد آئی بانسریا

جب وہ منظر ہی خواب سے نہ رہے
سانس کا سلسلہ رہے نہ رہے

روشنی بہہ رہی ہے گلیوں میں
یعنی جتنے چراغ تھے نہ رہے

تیرے آنے کی سرخوشی نہ رہی
تیرے جانے کے وسوسے نہ رہے

جیسے کیسے گزر ہی جاتے ہیں
جب یہ دن بھی برے بھلے نہ رہے

اب بھی آنکھوں میں رات کٹتی ہے
ہاں ، غزل پوش رتجگے نہ رہے

کچھ ابھی انتظار ہے دل کو
کون جانے گجر بجے نہ رہے

جان کا اعتبار ہی کیا ہے
وہ اچانک دکھائی دے نہ رہے

مسکراہٹ بھی چھن گئی اسلم
آنسوؤں سے بھی رابطے نہ رہے

اسرار احمد سہاروی

جوش جنوں میں یاد کہاں رہگزر مجھے
صحرا میں لا کے چھوڑ گیا راہبر مجھے

شہر وفا کی یاد میں دل کو لئے پھرا
لیکن کہیں ملا نہ تمہارا نگر مجھے

داغوں کے پھول دل میں سجائے ہیں شوق سے
رشک بہار ہیں مرے زخم جگر مجھے

مجھ کو بھی اپنے فن پہ ابھی کچھ گماں نہیں
وہ بھی سمجھ رہے ہیں ابھی بے ہنر مجھے

کچھ چارہ ساز کر نہ سکے زخم کا علاج
افسوس ہے دعا بھی ملی بے اثر مجھے

گم کردہ راہ ہوں کوئی منزل نہیں مری
لے جائے گا نہ جانے کہاں ہم سفر مجھے

اسرار میرے عجز نے یہ کیا اثر کیا
احباب نے سمجھ لیا بے بال و پر مجھے

ارشد لطیف

نہ کر اے دل تو میرے ساتھ ایسے
کٹے گی کس طرح پھر رات ایسے

تجھے موسم سے لینا دینا کیا ہے
مگر ہے آج کل برسات ایسے

وہ جیسے جانتا کچھ بھی نہیں ہے
کرے گا مجھ سے اکثر بات ایسے

مرے سب زخم تازہ کر دیئے ہیں
گلے اس نے لگایا ساتھ ایسے

نہیں دکھ کا مداوہ پاس اس کے
نہیں رویا وہ میرے ساتھ ایسے

میں ارشد جانتا ہوں دیکھتا ہوں
کہ دل کو ہو رہی ہے مات ایسے

اسرار زیدی

یوں ہر اک درد کا سودا تو نہیں ہوسکتا
میں ترے شہر میں رسوا تو نہیں ہوسکتا

میرے بس میں تو نہ تھا زخم پہ مرہم رکھنا
ہر کوئی شخص مسیحا تو نہیں ہوسکتا

میں ترے درد کو محسوس تو کرسکتا ہوں
میں ترے غم کا مداوا تو نہیں ہو سکتا

رات بے چاند منور تو نہیں ہوسکتی
گھر میں بے شمع اجالا تو نہیں ہوسکتا

حادثہ یہ ہے کہ پتھر نہیں انسان ہوں میں
دل مرا لالہ ء صحرا تو نہیں ہوسکتا

تم بھی مانو گے کہ ہر بات کی حد ہوتی ہے
روز یوں وعدہ فردا تو نہیں ہوسکتا

جواب کے دائروں میں رہ کر سوال کرنا
ہمیں نہ آیا کچھ اس طرح عرض حال کرنا

نہ جانے کیا مصلحت ہو، اس کے مکالموں میں
جو پاس بیٹھو تو صرف اتنا خیال کرنا

یہ لوگ مارے ہوئے ہیں اندھی مسافتوں کے
انہیں نہ آیا صداقتوں سے وصال کرنا

کوئی وسیلہ تو ہو کہ اک سیل حرف اُمڈے
جو کر سکو تم سو پھر یہ کار محال کرنا

یہ منجمد ساعتیں تو پتھر ہیں راستے کی
یہیں سے آغاز پرسش ماہ و سال کرنا

یہ اونگھتے ولولے بھی اک روز جاگ اٹھیں گے
ضمیر بیدار ہو تو پھر کیا ملال کرنا

ارشد محمود ناشاد

نگاہیں خواب منظر دیکھتی ہیں
مگر رستے میں دیواریں کھڑی ہیں

دیئے کی لو مسلسل بڑھ رہی ہے
ہوائیں لڑتے لڑتے تھک گئی ہیں

وہاں میری گواہی کون دے گا؟
جہاں سچائیاں خوں چاٹتی ہیں

شجر بے پیرہن ہونے لگے ہیں
بہاریں خون تازہ مانگتی ہیں

پرانی پگڑیاں پیروں تلے ہیں
نئی نسلیں بغاوت کر رہی ہیں

اسعد بدایونی

دل وحشی تجھے اک بار پھر زنجیر کرنا ہے
کہ اب اس سے ملاقاتوں میں کچھ تاخیر کرنا ہے

سپاہی، مورچوں میں جیتنا آسان ہے، ہو گا
بہت مشکل مگر ملک بدن تسخیر کرنا ہے

مرے پچھلے بہانے اس پہ روشن ہو گئے سارے
سو اب مجھ کو نیا حیلہ نئی تدبیر کرنا ہو ہے

ابھی امکان کے صفحے بہت خالی ہیں دنیا میں
مجھے بھی ایک نوحہ جابجا تحریر کرنا ہے

کہاں داروں کو اس سے کیا غرض پہنچے کہ رہ جائے
انہیں تو بس اشارے پر روانہ تیر کرنا ہے

اسلم رحیل میرزا

یہ مانا بند کر دو گے زباں کو
نہ لیکن روک پاؤ گے فغاں کو

چمن ویران ہوتا جارہا ہے
بدل دو اب تو نظمِ گلستاں کو

ستارے ماند پڑتے جارہے ہیں
طلوع ہونے دو مہرِ زرفشاں کو

نیا آدم نئی دنیا بساؤ
بدل ڈالو پرانے آسماں کو

نئے نغمے نئے سازوں پہ چھیڑو
نہ دہراؤ پرانی داستاں کو

بساطِ زندگی سب لٹ چکی ہے
سجاؤ پھر سے تم بزمِ جہاں کو

نمودِ صبحِ نو کے ہیں یہ آثار
ادھر دیکھو اجڑتی کہکشاں کو

یہ مستقبل کے لاشک حکمراں ہیں
نہ روکو یورش محنت کشاں کو

بڑی تاریک ہیں ہستی کی راہیں
ذرا آنے دو اب تو مہ وشاں کو

اصغر علی شاہ

یہ نظم بھی ہم اہل ہنر رکھتے ہیں
کاغذ پہ زبانوں کو کتر رکھتے ہیں

انسان بھی لفظوں کے امر طوطوں میں
رکھتے ہیں کبھی جان اگر رکھتے ہیں

پاداش ہماری ہوا کالا پانی
وہ یوں کہ سیہ رنگ گہر رکھتے ہیں

کچھ لوگ ہیں اجسام پہ چہروں کی جگہ
عبرت کے عجوبات کا گھر رکھتے ہیں

بینائی کہاں جائے کہ ہم ظلماتی
آنکھوں کے چراغوں سے حذر رکھتے ہیں

کانوں کی جگہ باندھ کے چڑمر پتے
بہرے ہیں، دکھاوے کو مگر رکھتے ہیں

وہ جن کو نہ راس آئی عنایت کی بہشت
خود ساختہ دوزخ میں بسر رکھتے ہیں

وہ شعبدہ گر ہیں ترے افسوں کے اسیر
اوہام کے جو زیر و زبر رکھتے ہیں

اشرف سلیم

وصول کیا ہوا کیا رائیگاں نہیں دیکھا
بھٹکتے دل کو سنبھلتے ہوئے نہیں دیکھا
تری طلب تھی کہ سود و زیاں نہیں دیکھا
ہوا کو سمت بدلتے ہوئے نہیں دیکھا

محبتوں میں یہی کچھ ہوا ہے شام فراق
بکھرنا کام ہے خوشبو کا سو بکھرتی ہے
جہاں تھا شہر تمنا وہاں نہیں دیکھا
گلوں کو ساتھ نکلتے ہوئے نہیں دیکھا

یہ دل کی گلی بھی عجیب ہے کہ جہاں
کوئی تلاش ہے آوارگی کے پردے میں
مکیں تو دیکھے ہیں لیکن مکاں نہیں دیکھا
سو اضطراب کو ٹلتے ہوئے نہیں دیکھا

رہا نہ کوئی تعلق تو پھر سلیم کبھی
بچھڑتے وقت کہا تھا کہ مر ہی جائیں گے
پلٹ کے شہر دل رفتگاں نہیں دیکھا
کسی کو زہر نگلتے ہوئے نہیں دیکھا

اظہار شاہین

پتھروں میں بے وفا کوئی نہ تھا
آدمی سے بولتا کوئی نہ تھا

تھکے ہوئے ہیں بدن اب تو یہ کیا جائے
خمار لے کے کوئی اس طرف چلا جائے

کون دیتا تھا سوالوں کا جواب
گھر میں تو میرے سوا کوئی نہ تھا

کہیں تو پہنچو گے آخر کسی حوالے سے
چلے چلو کہ جدھر کوئی راستہ جائے

جیسے نابینا تھے اہل شہر سب
میری جانب دیکھتا کوئی نہ تھا

گئی رتوں کی طرح اب کے بے خبر نہ رہو
جو ٹوٹتے ہو تو کانوں تلک صدا جائے

اس نے تحفے میں مجھے دھاگہ دیا
میں نے دیکھا تو سرا کوئی نہ تھا

تمام شہر ہی بھیگا ہوا ہے بارش میں
فسانہ کونسی دیوار پر لکھا جائے

میرے پیچھے واقعوں کی فوج تھی
میرے آگے راستہ کوئی نہ تھا

وہ پڑھ کے آیا ہے اخبار آج کا جیسے
وہ ایک شخص جو بازار دیکھتا جائے

دیکھ کر سایا خوشی سے جھوم اٹھا
مجھ سے بستی میں بڑا کوئی نہ تھا

میں انتظار کروں گا بہار آنے تک
کسی شجر پہ نشانی کوئی لگا جائے

منظروں سے اس طرح گزرا ہوں میں
جیسے میرا واسطہ کوئی نہ تھا

اب اپنے شہر میں چہرے پرانے لگتے ہیں
پرائے دیس میں دو چار دن رہا جائے

بھر گیا کاغذ تمہارے نام سے
ایک جملہ بھی لکھا کوئی نہ تھا

بہت سے لفظ نئے دے رہا ہے کہنے کو
پرند سر پہ ہمارے جو بولتا جائے

اطہر عظیم خان

جو تیرے قرب کا لمحہ سمیٹ لیتا ہے
وہ ایک لمحے میں کیا کیا سمیٹ لیتا ہے

میں اس سے مل کے کبھی ہوش میں نہیں رہتا
وہ میرے ضبط کو تنہا سمیٹ لیتا ہے

ہزاروں میل سے بھی مجھ کو ڈھونڈ لائے گا
وہ اپنے قدموں سے دریا سمیٹ لیتا ہے

تمہاری یاد کی صورت ہر ایک رات ڈھلے
تمام شب کا اندھیرا سمیٹ لیتا ہے

کسی کو اپنی طرف بڑھنے ہی نہیں دیتا
قدم اٹھاؤ تو رستہ سمیٹ لیتا ہے

وہ کس امید پہ مانگیں دعائیں بارش کی
کہ جن کی فصل کو دریا سمیٹ لیتا ہے

یہ زندگی بھی اچانک ہی ختم ہوتی ہے
وہ لکھتے لکھتے ہی پرچہ سمیٹ لیتا ہے

فضا میں تیرنے لگتے ہیں لفظ مبہم سے
وہ جب کلام سے لہجہ سمیٹ لیتا ہے

روشنی کے قریب تر ہو جاؤں
اب چراغ دم سحر ہو جاؤں

ہاتھ پکڑے مجھے وہ چلنا سکھائے
جی یہ کرتا ہے بے ہنر ہو جاؤں

مجھ کو حسرت سے دیکھنا اس کا
سوچتا ہوں کہ بے ثمر ہو جاؤں

اس کا غم میری ذات سے چھلکے
کاش میں اس کی چشم تر ہو جاؤں

راستے کے قریب بیٹھا ہوں
جانے کب کس کا ہم سفر ہو جاؤں

میری یکسانیت سے ڈرتے ہو
اور تبدیل میں اگر ہو جاؤں

نام لے کر مجھے پکارے وہ
کاش میں اتنا معتبر ہو جاؤں

اعجاز رحمانی

یہ تو ہر شام شغل ہوتا ہے
روز سورج کا قتل ہوتا ہے

سب سے رکھتے ہو کیوں امید کرم
بے ثمر بھی تو نخل ہوتا ہے

پوچھتی ہے یہ پاؤں کی زنجیر
کس عدالت میں عدل ہوتا ہے

جس کو کہتے ہیں عالم وحشت
عرصہ کار عقل ہوتا ہے

دل ملے تو کسی سے کیسے ملے
دھڑکنوں میں بھی فصل ہوتا ہے

میرے لب پر بھی ہے سکوت وہی
وہ جو طوفاں سے قبل ہوتا ہے

ہو کسی سے بھی گفتگو اعجاز
ذکر اپنا دراصل ہوتا ہے

افتخار شفیع

دنیائے بے ثبات سے ہو کر امر گئے
اپنی بقا کے واسطے کچھ لوگ مر گئے

کچھ بھی نہ مل سکا انہیں محرومیوں کے بیچ
مہتابی جمال کے پیکر گزر گئے

لہروں میں سارا ڈوب گیا چاندنی کا جسم
ساحل پہ آکے لوگ سمندر سے ڈر گئے

دل میں کبھی خیال بھی آتا نہیں ترا
تم سے جدا ہوئے تو زمانے گزر گئے

اگنے لگے خیال کے صحرا میں سرخ پھول
تم سے ملی نگاہ تو منظر نکھر گئے

وہ افتخار جن کی مہک تھی وجود میں
باسی تھے کس دیار کے جانے کدھر گئے

افضال ملک

راز یہ روز ازل سے دل جبریل میں ہے
جو مزہ ہے 'وہ' تری بات کی ترسیل میں ہے

گردش وقت ہوں! مجھ سے ہیں نظام شمسی
روشنی جتنی بھی ہے سب مری تحویل میں ہے

بحر ہستی کا بھنور کیا ہے؟ تجھے کیا معلوم
تیری کشتی تو کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں ہے

چاہئے ایک قیامت یہ سمجھنے کے لئے
کیا صدا ہے ؟ جو چھپی صور سرافیل میں ہے

ظلم کے ہاتھ ابھی اور بھی لمبے ہوں گے
ابھی ابلیس خطاؤں کے لئے ڈھیل میں ہے

اہل فن اہل ہنر سب مرے گرویدہ ہیں
نسخہ کیمیا گویا میری زمبیل میں ہے

کیا ڈرائیں گے اندھیرے مجھے افضال ملک
نور علی نور مری روح کی قندیل میں ہے

ڈاکٹر افضل اقبال

مجھے کہنا ہے جو کچھ کہہ رہا ہوں
سخن کی سختیوں کو سہہ رہا ہوں

ملے ہمت کی کچھ تو داد یارب
تری دنیا میں اب تک رہ رہا ہوں

مجھے موجوں سے موتی رولنا ہے
میں دریا کے مخالف بہہ رہا ہوں

جناب نوح کو کوئی خبر دے
تری کشتی ابھی تک کھے رہا ہوں

فلک پہ تھا تو تھا سدرہ سے اوپر
سمندر میں بھی تہہ در تہہ رہا ہوں

افضل گوہر

شکست کھا کے بھی کب کم ہوئے ہیں غم میرے
مرے کٹے ہوئے ہاتھوں میں ہیں علم میرے

میں اپنے شہر سے کن جنگلوں میں آنکلا
ہوا چلی تو ٹھہرنے لگے قدم میرے

تو ایسی دھوپ کہ جس میں ہیں روشنی کے رنگ
میں آفتاب اجالے ہوئے ہیں کم میرے

جمی رہی ہے چٹانوں پہ برف صدیوں تک
تو جا کے تب کہیں پتھر ہوئے ہیں نم میرے

پناہ گاہ مجھے بھی تو ٹور جیسی ہی دے
مری تلاش میں دشمن ہیں تازہ دم میرے

اقبال راہی

اک تعلق شمع کی صورت ہے محفل سے مجھے
کر سکو گے تم نظر انداز مشکل سے مجھے

دور کیوں رکھا گیا ہے میری منزل سے مجھے
پوچھ کر کوئی بتا دے خضر کامل سے مجھے

اور بھی دنیا میں ہے کیا گوشہ تسکیں کوئی
کیوں اٹھا لایا مرا دل تیری محفل سے مجھے

میں نے مڑکر بھی نہ دیکھا جستجو کے شوق میں
ہم سفر دیتے رہے آواز منزل سے مجھے

باندھ کر ہاتھوں کو زلف خم بہ خم کے پیچ میں
آشنا کر دیجئے قید سلاسل سے مجھے

جو کبھی رہتے تھے میرے ساتھ سائے کی طرح
نام بھی اب ان کا یاد آتا ہے مشکل سے مجھے

ڈوبنے کا تو مجھے کچھ غم نہیں راہی مگر
ناخدا نے ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے مجھے

اکرم سحر

میت مضطرب ہے آرزو مجروح غم
ـسی میں آرزوؤں کی ردا اشکوں سے نم

ـہ رہا ہے آستان غیر پر غیرت کا خون
ے حسی نے کردیا انسان کے ماتھے کو خم

ـنک جبر و قہر کی دیوار ہے جو ہر طرف
ڑ دیں گے ایک دن ایثار کے تیشے سے ہم

ن کی نظروں کو نہیں عرفان رب کائنات
و بساتے ہیں دلوں کے شیش محلوں میں صنم

ائز منزل ہو کیسے ان کا جذب جستجو
فلسی جکڑے ہوئے ہے دیدہ و دل کے قدم

و گئے تھے خون جس میں رہروان زندگی
گ رہے ہیں اب اسی جنگل کے سینے سے ارم

ی لیا جس بادہ کش نے بادہ عرفان ذات
س کے دست کیف زا کو ڈھونڈتا ہے جام جم

من کے انوار برسائیں زمیں پر کس طرح
رات انجم کر رہے تھے مشورہ مل کر بہم

فکر کے سورج اگاتا ہے شب تاریک سے
یاد رکھیں گے سحر کو مدتوں اہل قلم

اکبر بخاری اکبر

جہان بھر کے غموں کو اکبر جو اپنے دل میں چھپا رہا ہے
عجیب سا ایک شخص ہے وہ زمانے بھر کو ہنسا رہا ہے

یہ ٹھیک ہے کہ اداسیوں کا یہ سرد موسم اسی طرح ہے
مگر کسی کے لئے مرا دل سرور سے گنگنا رہا ہے

خرید لایا ہوں راحتوں کا تمام سامان میں جہاں سے
قرار دل کو کسی بھی کروٹ مگر نہیں پھر بھی آرہا ہے

کلی نے دن میں گلاب سے آج یوں کہا تھا کلام دیکھو
شباب تجھ پر سے جارہا ہے عذاب یہ مجھ پہ آرہا ہے

جمی تھی تن پر گئے زمانوں کی دھول جانے ہمارے کتنی
نئے خیالوں کا رنگ اپنا اثر بھی لیکن دکھا رہا ہے

پگھل رہی ہے کسی کے لہجے میں درد کی برف خامشی سی
یقیں ہے دل میں ضرور اس کے وہ جھوٹے وعدے نبھا رہا ہے

یہ اٹھتی لہریں مسافرت کا پیام دے کر سمٹ رہی ہیں
کسی طرف سے کوئی بگولہ سفر کا پیغام لا رہا ہے

اکبر حمیدی

جب نہ کچھ کام ہو تو کیا کیجئے
نام ہی نام ہو تو کیا کیجئے

نہ کہیں اوٹ ہو کسی در کی
نہ کوئی بام ہو تو کیا کیجئے

میرے گھر سے تمہارے گھر کا سفر
ایک دو گام ہو تو کیا کیجئے

جب کوئی کاروبار شوق نہ ہو
کام ہی کام ہو تو کیا کیجئے

تیری صورت نہ دیکھنے کو ملے
صبح ہو شام ہو تو کیا کیجئے

ایک میرے ہی سر میں درد رہے
سب کو آرام ہو تو کیا کیجئے

آقا حق ناشناس ہو جائے
بندہ بے دام ہو تو کیا کیجئے

کچھ بھی اچھا لگے نہ جب اکبر
خاص بھی عام ہو تو کیا کیجئے

الطاف شاہد

آزار وفا ، ان کے تغافل سے ملے ہیں
جو غم بھی ملے ہم کو، تسلسل سے ملے ہیں

حائل ہیں بہرگام وہ ہستی کے سفر میں
جو ہم کو اندھیرے ترے کاکل سے ملے ہیں

ہم لوگ بے عجلت سر منزل نہیں پہنچے
منزل کے نشاں صبر و توکل سے ملے ہیں

اے حسرت دیدار چمن تیری بدولت
کچھ خار سے کچھ زخم ہمیں گل سے ملے ہیں

اس شہر خزاں میں بھی تو آثار بہاراں
قمری سے کبھی نغمہ بلبل سے ملے ہیں

اس گلشن ہستی میں کئی پھول تھے شاہد
کانٹے یہ تجھے تیرے تساہل سے ملے ہیں

الیاس شاداں

نہ بے دلی سے نہ کچھ ناز خسروی سے ملا
وہ پہلی بار عجب شان دلبری سے ملا

میں اس زمیں پہ خدا کی تلاش کیا کرتا
میں آدمی تھا سو اک اور آدمی سے ملا

زمیں کی اور بلند آسماں ہی جھکتا ہے
نہ اپنی جھوٹی انا کو مری خودی سے ملا

عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ تم سے الگ
تمہارے شہر کا ہر شخص بے رخی سے ملا

بسا تھا آنکھ میں منظر تری جدائی کا
بچھڑ کے تجھ سے نہ میں پھر کبھی کسی سے ملا

میں جستجو میں تری دربدر پھرا لیکن
ترا پتا بھی تری بندہ پروری سے ملا

جو کج کلاہ زمیں پر نہ پاؤں رکھتا تھا
وہ جب ملا تو بہت مجھ سے عاجزی سے ملا

دل و نگاہ پہ بجلی سی گر پڑی شاداں
میں رات خواب میں اک ایسی روشنی سے ملا

ڈاکٹر امام اعظم

تمہیں دیکھوں تو سب ویرانیاں شاداب لگتی ہیں
تمنائیں مری بانہوں کی لیکن خواب لگتی ہیں

تری آنکھوں میں جب جب تیرتے ہیں اشک کے قطرے
مری ہستی کی ساری وسعتیں گرداب لگتی ہیں

سسکتی ساعتوں میں سانس لیتی گھر کی دیواریں
بہت بے نور ہوتی ہیں بہت بے آب لگتی ہیں

زمیں کے ہونٹ اک اک بوند کو اب بھی ترستے ہیں
بظاہر دور سے سب کھیتیاں سیراب لگتی ہیں

بہت اخلاص سے ملنے چلے آئے وہ ، اے اعظم
ہزاروں سازشیں لیکن پس محراب لگتی ہیں

امجد حمید محسن

وہ فکر کے جزیروں میں ہنستا ہوا ملا
یا پھر تخیلات میں بھٹکا ہوا ملا

یادوں کی شاخ شاخ پہ پھوٹیں وہ کونپلیں
دامن ہر ایک سوچ کا مہکا ہوا ملا

اس کا مزاج وقت کے شاہوں کی مثل تھا
سیلاب غم میں آج وہ بہتا ہوا ملا

اپنے دکھوں کا ذکر کسی سے میں کیا کروں
جو شخص بھی ملا مجھے ٹوٹا ہوا ملا

چادر بچھی وہ دھوپ کی میرے مکان میں
گملوں میں تازہ پھول بھی سوکھا ہوا ملا

کتنا بلند عزم تھا راہ الم میں وہ
منزل ہے پاؤں میں مرے کہتا ہوا ملا

محسن نئی کتاب کی تیاریوں میں گم
محسن یہ کس خیال میں کھویا ہوا ملا

امجد ضیاء

وہم یہ ہی ہر ایک آن رہا
میرے پاؤں میں آسمان رہا

مجھ کو بادل تلاش کرتے رہے
ڈھونڈتا مجھ کو سائبان رہا

ایک خلوت رہی مری ساتھی
اور کرائے کا اک مکان رہا

میں خدا کے جہان میں تھا مگر
میرے اندر بھی اک جہان رہا

خامشی بھاگ کر چلی آئی
کوئی بھی جب نہ درمیان رہا

شہر میں نفرتوں کے آج ضیاء
چاہ کی کھول کر دوکان رہا

امجد علی امجد

وحشتوں کی ہر گھڑی میں تیرگی ہے زندگی
اک یہی میری نظر میں روشنی ہے زندگی

ہجر کا موسم بدلتے ہی یہ مجھ کو کہہ گیا
قربتوں کی جستجو میں شبنمی ہے زندگی

درد کا رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں تقدیر سے
سوچتا رہتا ہوں پھر بھی اجنبی ہے زندگی

پر نہ جل جائیں کہیں اس کے، پلک بھر سوچنا
ان دنوں اونچی اڑانیں اڑ رہی ہے زندگی

حرف پتوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں ذہن میں
حرف سے خوشبو بنانا چاہتی ہے زندگی

رات پھر چشم فلک سے سب تارے جھڑ گئے
بے اماں سی ہو کے، امجد! رہ گئی ہے زندگی

انجم سلیمی

دن لے کے جاؤں ساتھ، اسے شام کرکے آؤں
بیکار کے سفر میں کوئی کام کرکے آؤں

بے مول کر گئیں مجھے گھر کی ضرورتیں
اب اپنے آپ کو کہاں نیلام کرکے آؤں

میں اپنے شور و شر سے کسی روز بھاگ کر
اک اور جسم میں کہیں آرام کر کے آؤں

دل سے اترتا جاتا ہے وہ یار خاص بھی
اب کے اسے ملوں تو اسے عام کرکے آؤں

کچھ روز میرے نام کا حصہ رہا ہے وہ
اچھا نہیں کہ اب اسے بدنام کرکے آؤں

انجم میں بد دعا بھی نہیں دے سکا اسے
جی چاہتا تو تھا وہاں کہرام کرکے آؤں

افسر علی افسر

صدا بن کر ابھرنا چاہتے ہیں
یہ سناٹے بکھرنا چاہتے ہیں

چراغوں کے دریچوں سے نکل کر
اجالے پھر سنورنا چاہتے ہیں

نگاہوں سے اتر کر کیا کریں گے
ترے دل سے اترنا چاہتے ہیں

ہمیں اے زندگی نزدیک رکھنا
تری بانہوں میں مرنا چاہتے ہیں

بہت ہی شوق ہے اس تجربے کا
سرابوں سے گزرنا چاہتے ہیں

جو اپنے آپ قاتل ہوں وہ افسر
مجھے مصلوب کرنا چاہتے ہیں

انوار فیروز

عجب عذاب ہے رستے کا یہ پڑاؤ بھی
کہ خود ٹھٹھرتے رہو اور جلنے الاؤ بھی

صداقتوں کا صحیفہ کبھی نہ بیچوں گا
یہ جرم ہے تو مجھے دار پر چڑھاؤ بھی

نہ جانے کونسی رت ہے کہ پھول مرنے لگے
ادھر یہ حکم کہ دیکھو تو مسکراؤ بھی

اڑی وہ گرد کسی آئینے میں عکس نہیں
برسنے والا کوئی ابر ڈھونڈلاؤ بھی

مجھے یقیں ہے کہ ساحل تلاش کر لے گا
کسی بھنور میں ہماری شکستہ ناؤ بھی

پکڑ تو لیتی ہے پاؤں جہاں کی رونق پر
کبھی تو لوٹ کے رہنے گھروں کو آؤ بھی

یہ خامشی تو قیامت سے کم نہیں یارو
فصیل شہر سے طوفاں کوئی اٹھاؤ بھی

ہرے ہیں زخم تو انوار کیسی ویرانی
کہ فصل گل کی علامت ہے دل کا گھاؤ بھی

انوار فیروز

ساری دنیا چاک گریباں
آنکھ میں آنسو خامہ بداماں

طوق و سلاسل ٹوٹ گئے ہیں
رک تو سہی اے گردش دوراں

نغمہ بہ لب جو دار پہ آئے
ان کو دیکھ کے دنیا حیراں

لاکھ حوادث لاکھ مصائب
پھر بھی رقصاں پھر بھی غزل خواں

خلقت کو آلام نے گھیرا
جو ملتا ہے سو ہے پریشاں

کسی کو اپنا دوست بنائیں
دشمن ہے انساں کا انساں

رات کا جادو ٹوٹ رہا ہے
پھوٹے کی اب صبح درخشاں

ہم ممتاز جہاں میں سب سے
ہم سے نہ الجھے گردش دوراں

جس چہرے کو دیکھا ہم نے
آئنے کی صورت تھا وہ حیراں

ہم نے ہی فیروز جہاں میں
بدلا ہے آئین گلستاں

انور شعور

مجھے یہ جستجو کیوں ہو کہ کیا ہوں اور کیا تھا میں
کوئی اپنے سوا ہوں میں کوئی اپنے سوا تھا میں

نہ جانے کون سا آتش فشاں تھا میرے سینے میں
کہ خالی تھا بہت پھر بھی دھمک کر پھٹ پڑا تھا میں

تو کیا مستی میں میں نے واقعی یہ گفتگو کی تھی؟
مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا جو سوچتا تھا میں

خود اپنے خول میں گھٹ کر نہ رہ جاتا تو کیا کرتا
یہاں اک بھیڑ تھی جس بھیڑ میں گم ہوگیا تھا میں

نہ لٹنا میری قسمت ہی میں تھا لکھا ہوا ورنہ
اندھیری رات تھی اور بیچ رستے میں کھڑا تھا میں

گزرنے کو تو مجھ پر بھی عجب اک حادثہ گزرا
مگر یہ جب ہوا جب غم کا عادی ہو چکا تھا میں

میں کہتا تھا سنو سچائی تو خود ہے صلہ اپنا
یہ نکتہ اکتسابی تھا مگر سچ بولتا تھا میں

خلوص و التفات و مہر جو ہے اب اسی سے ہے
جسے پہلے نہ جانے کس نظر سے دیکھتا تھا میں

تجھے تو دوسروں سے بھی الجھنے میں تکلف تھا
مجھے تو دیکھ اپنے آپ سے الجھا ہوا تھا میں

جو اب یوں میرے گرداگرد ہیں کچھ روز پہلے تک
انہیں لوگوں کے حق میں کسقدر صبر آزما تھا میں

بہت خوش خلق تھا میں بھی مگر یہ بات جب کی ہے
نہ اوروں ہی سے واقف تھا نہ خود کو جانتا تھا میں

انور شعور

اگرچہ ہیں وہ اسی شہر کے مکینوں میں
گزشتہ سال ملے تھے انہی مہینوں میں

کنارِ بحر سرِ شام جھلملاتے ہیں
چراغ پیرہنوں میں ، قمر جبینوں میں

تم اور اتنی تواضع؟ یقیں نہیں آتا
شراب سی ہے نگاہوں کے آبگینوں میں

لبوں پہ مہر لگے چار دن ہوئے ہیں مگر
ابھی سے آگ بھڑکنے لگی ہے سینوں میں

سب اپنے اپنے دُر و لعل گاڑ آتے ہیں
لحد سا کوئی دفینہ نہیں دفینوں میں

گلے تو فاتح و مفتوح مل رہے ہیں شعور
مگر چھپے ہوئے خنجر ہیں آستینوں میں

ایوب جوہر

یہ کن دکھوں نے زمانے کو آج گھیرا ہے
بجھ ہوئی ہیں نگاہیں اداس چہرہ ہے

جو دل جلا نہ سکو زخمِ دل ہی مہکاؤ
کہ رات ہے بڑی لمبی ، گھنا اندھیرا ہے

نہ جانے کیا نظر آئے عروسِ دید ہمیں
ابھی تو دھند ہے گہری دبیز کہرا ہے

نہ کانچ ہے کوئی اور نہ ہی سنگ ریزہ کوئی
یہ دل بھی آج کہاں کس جگہ پہ ٹھہرا ہے

کریں تو کس سے طلب ہم یہاں پہ داد رسی
زمانہ سارے کا سارا تو گونگا بہرہ ہے

نپٹ لوں ان سے تو پھر بات ہوگی تم سے بھی
ابھی تو گرد مرے زخموں کا ہی ڈیرہ ہے

میں کہہ سکا نہیں جوہر جو کہہ رہے تھے سبھی
یہی تو ہے وہی پرچم وہی پھریرا ہے

انیس انصاری

سورج کا لگا آئے ہیں چکر نہیں دیکھا
بکھرا تھا سر خاک جو اک گھر نہیں دیکھا

سینے میں جلا رکھی ہیں شمعیں ابھی ہم نے
گو طاق کو مدت سے منور نہیں دیکھا

زنجیر ہلاؤ کہ جہانگیر نہ سو جائے
آنکھوں نے کھلے قتل کا منظر نہیں دیکھا

ہنستا ہے کہ انصاف کی حاجت ہے بھلا کیوں
پہلے کبھی کمزور کو بے گھر نہیں دیکھا

مٹی میں پڑے خون سے لگتا ہے کہ شاید
قاتل نے پس قتل بھی مڑکر نہیں دیکھا

جو چاہو ستم ڈھاؤ ، بضد ہم بھی ہیں ہم نے
بے داد کے قدموں کے تلے سر نہیں دیکھا

آنکھوں میں وہ منظر ہیں کہ سونے نہیں دیتے
اک عرصہ ہوا چین کا بستر نہیں دیکھا

سب نور کی مٹی میں رکھیں جو بھی جہاں ہیں
سورج سے بڑا امن کا لشکر نہیں دیکھا

اب رہنے بھی دے حد سے نہ بڑھ شہر ستم گار
تو نے ابھی افلاک کا چکر نہیں دیکھا

وہ میری زمیں سے ہی ہٹاتا رہا مجھ کو
اس طرح کا معصوم ، ستم گر نہیں دیکھا

ہم جیسے فقیروں کو کہاں فکر سفر میں
کوفے کو جو نکلے تو ہیں پھر گھر نہیں دیکھا

اس شہر میں رہنے کو جلا آئے ہیں کشتی
ہم نے کبھی ساحل سے سمندر نہیں دیکھا

اے.جی.جوش

ہوتا ہے کچھ ایسا جوش جوانی میں
جیسے کوئی دریا ہو طغیانی میں

اس کو دیکھ کے ہوتا ہے احساس اکثر
روپ کی دھوپ کھلی ہو بہتے پانی میں

ایسی خوشبو بکھری اس کی زلفوں کی
جس کو دنیا ڈھونڈے رات کی رانی میں

ہم نے قید رکھا تھا جس کو ہونٹوں میں
آنسو کہہ گئے آج وہ بات روانی میں

جانیں کتنے رنگ بہاریں لائی تھیں
جوش مگر رو پوش رہا حیرانی میں

بشیر سیفی

شہر سارا اوڑھ کر جب چپ کی چادر سو گیا
رات کی تربت میں میں ہی لاش بن کر سو گیا

دن چڑھا تو روشنی کے تیر اندھا کر گئے
رات کو میں تیرگی کا زہر کھا کر سو گیا

نرم بستر پر بھی میں بے خواب و مضطر ہی رہا
چین سے لیکن کوئی فرش زمیں پر سو گیا

میرے کمرے میں مرے اپنے سوا کوئی نہ تھا
تیرگی میں کون یہ میرے برابر سو گیا

رقص میں ڈوبی ہوئی داسی کے پاؤں کیا تھمے
گھور سناٹے میں سیفی سارا مندر سو گیا

بختیار احمد

ہمارے سامنے ساحل نہیں ہے
کبھی جو تھی وہی منزل نہیں ہے

زندگی کو زیست کرتا آگیا
دل لگاتا آہ بھرتا آگیا

بہت روتا تھا میں سب جھیل لوں گا
مگر سینے میں اب وہ دل نہیں ہے

دوستوں نے یوں نبھائیں یاریاں
دشمنی سے راہ کرتا آگیا

لٹا دیں دین و دنیا اپنی کیونکر
کسی رخسار پہ وہ تل نہیں ہے

کون کہتا ہے ہمارے شہر کو
مر کے جینا جی کے مرنا آگیا

مزا خنجر کے چلنے کا ملے کیا
کٹے جاتے ہیں تو بسمل نہیں ہے

بس گئی ہیں جسم میں وہ حدتیں
سائے کو بھی دھوپ کرنا آگیا

کٹا کر سر یہ سب نے دی شہادت
یہاں کوئی بھی اب قاتل نہیں ہے

آج دیکھا ہے قبیلہ شہر کو
اپنی آنکھیں بند کرنا آگیا

نجش لائلپوری

اسیری میں بھی خود کو باخبر رکھے ہوئے ہیں
قفس کی چار دیواری میں در رکھے ہوئے ہیں

نئی اک صنعت الفاظ جاری ہوگئی ہے
پرانے لفظ ہم نے سان پر رکھے ہوئے ہیں

خدا معلوم کس کس دیس خاک ان کی اڑے گی
ہوا کے دوش پر مٹی کے گھر رکھے ہوئے ہیں

ان ایوانوں کو اک دن سرنگوں ہونا پڑے گا
جن ایوانوں کی بنیادوں میں سر رکھے ہوئے ہیں

وہی مقتل وہی قاتل وہی طرز ستم ہے
فقط خنجر بہ انداز دگر رکھے ہوئے ہیں

ستم تیرے کوئی اب راز کی باتیں نہیں ہیں
یہ افسانے مرے پیش نظر رکھے ہوئے ہیں

لباس خامشی ہر شخص نے پہنا ہوا ہے
کئی خنجر لب اظہار پر رکھے ہوئے ہیں

زباں پہ نجش تو ذکر حسین ابن علی ہے
تہہ داماں کئی ابن شمر رکھے ہوئے ہیں

سب اپنی ہوس میں جلتے ہیں اور درد پرایا ختم ہوا
دیوار کے ہم جو قریب آئے ' دیوار کا سایا ختم ہوا

جو لہر لہو میں اٹھی تھی یخ بستہ بدن کی نذر ہوئی
منہ زور ہواؤں کے رخ پر جو دیپ جلایا ختم ہوا

ہر شاخ ثمرور سوکھ گئی ہر پیڑ زمیں کا رزق بنا
موسم کی بانجھ زمینوں میں جو بیج اگایا ختم ہوا

ہم آزادی کی راہوں میں مردوں کی صورت چلتے ہیں
احساس کی نبضیں ڈوب گئیں جاں کا سرمایہ ختم ہوا

بشیر رحمانی

اپنی سانسوں کی باس رہنے دے
کچھ تو اب میرے پاس رہنے دے

زہر کیوں گھولتا ہے روحوں میں
زندگی میں مٹھاس رہنے دے

جن پہ سایا ہے سبز پریوں کا
ان منڈیروں پہ گھاس رہنے دے

لاکھ رت ہے اداسیوں کی مگر
تو نہ دل کو اداس رہنے دے

نوچتا کیوں ہے چیل کی صورت
زندہ لاشے پہ ماس رہنے دے

ان ٹھٹھرتے سفید کھیتوں میں
لہلہاتی کپاس رہنے دے

رنگ تن پر نہیں جو پھولوں کے
خوشبوؤں کا لباس رہنے دے

تو ہے چہرہ یقیں کے پیکر کا
ٹکڑے ٹکڑے قیاس رہنے دے

اب تصور میں بھی آتی نہیں صورت اس کی
بن گئی قصہ پارینہ رفاقت اس کی

وہ بکھرتا ہے سر راہ سرابوں کی طرح
لکھ کے آیا ہوں سمندر پہ شکایت اس کی

استغاثے کا مرے دیکھئے کیا ہو انجام
شاید اس کے ہیں، وکیل اس کے، عدالت اس کی

کھر دری بات وہ کس طرح سنے گا میری
گل کی پتی سے بھی نازک ہے طبیعت اس کی

غیر ممکن ہے لکھاجائے کسی اور کا نام
کتبہ دل میں ہے تحریر محبت اس کی

بانٹتا ہے جو شب و روز مرادوں کے گہر
میرے دامن سے گریزاں ہے سخاوت اس کی

عمر بھر اس سے چھلکتی رہی خوشبوئے وفا
لمحہ بھر جس کو میسر ہوئی قربت اس کی

میری منزل ہے مہ و مہر کی حد سے آگے
اور خلاؤں میں بھٹکنا ہے روایت اس کی

جس نے بھیجی تھی مجھے درد کی سوغات بشیر
میں نے کی غم کے مصلے پہ عبادت اس کی

بشیر رزمی

ہر سو پانی سا لگتا ہے
صحرا بھی گویا دریا ہے

جس کو پرایا ہم نے سمجھا
اب وہ بھی اپنا لگتا ہے

لوگ جسے سجدہ کرتے ہیں
اس کو یہاں کس نے دیکھا ہے

لہروں کی آنکھیں بھر آئیں
ساحل پر پیاسا تڑپا ہے

کوئی مجھے پہچان نہ پایا
شہر کا شہر ہی کیا اندھا ہے

تو نے سارے پھول چنے ہیں
اس میں ہمارا بھی حصہ ہے

تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو
ہاتھ تو میں نے پھیلایا ہے

جس میں کسی کا خیال نہ مہکا
وہ موسم مفلس گزرا ہے

سحر کے دم سے اندھیروں کا سحر ٹوٹا ہے
اجالے بانٹنے والوں کو کس نے روکا ہے

لہو ٹپکنے لگا تیرگی کے سینے سے
قضا نے سرخ ستارے کا تیر مارا ہے

خوشی کی گود میں غم کچی نیند سوتے ہیں
سحر کا کام اندھیرے سمیٹ لینا ہے

بس ایک بار جسے چلتے چلتے دیکھا تھا
اسی کا چہرہ نگاہوں میں مسکراتا ہے

یہی دلیل منور ہے رات کٹنے کی
کہ میرا سایہ مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

جسے زمانہ چلا ہے اسیر کرنے کو
کبھی وہ رنگ کبھی وہ ہوا کا جھونکا ہے

ہزار بار جسے دیکھ کر نہیں دیکھا
ہزار بار اسے ہم نے کھو کے پایا ہے

دکھائی دینے لگے ہیں نقوش پس منظر
نظر کے سامنے آئینہ عکس فرما ہے

جسے شکستہ سمجھ کر سبھی نے چھوڑ دیا
اسی کھلونے کو رزمی خرید لایا ہے

بیدل حیدری

رہنے دے وتجگوں میں پریشاں مزید اسے
لگنے دے ایک اور بھی ضرب شدید اسے

جی ہاں وہی چراغ جو سورج تھا رات کا
تاریکیوں نے مل کے کیا ہے شہید اسے

وہ خط میں جب لکھے گا وہاں کی خزاں کا حال
میں پارسل کروں گا گلاب امید اسے

بازار اگر ہے گرم تو کرتب کوئی دکھا
سب گاہکوں سے آنکھ بچا کر خرید اسے

مدت سے پی نہیں ہے تو پھر فائدہ اٹھا
وہ چل کے آگیا ہے تو کرلے کشید اسے

مشکوک اگر ہے خط کی لکھائی تو کیا ہوا
جعلی بنا کے بھیج دے تو بھی رسید اسے

اس بت کدے کے شخص کا کیا اعتبار ہے
بیدل نہ سونپ کعبہ دل کی کلید اسے

بیتاب پیلی بھتی

آنکھوں میں بسے ہیں ابھی خوابوں کے جزیرے
مہکے ہوئے خوشرنگ گلابوں کے جزیرے

بڑھتا چلا آتا ہے عذابوں کا سمندر
کیا مجھ کو بچائیں گے ثوابوں کے جزیرے

آکاش پہ اڑتے ہوئے بادل کے یہ ٹکڑے
یوں لگتے ہیں جیسے کہ سحابوں کے جزیرے

دامن میں سمیٹے ہوئے لفظوں کے سمندر
دیکھے ہیں کئی میں نے کتابوں کے جزیرے

مجبور ہوا جاتا ہوں میں تشنہ لبی سے
کھینچے لئے جاتے ہیں سرابوں کے جزیرے

بیتاب سوالوں کے سمندر میں کھڑا ہے
کچھ ساتھ لئے اپنے جوابوں کے جزیرے

بیناگو ئنڈی

پیرزادہ حمید صابری

آج اک اداس شام بدن میں جو ڈھل گئی
لگتا ہے جیسے میری امیدیں کچل گئی

یہ سوچ کر کہ تجھ کو نہ دیکھیں گے اب کبھی
پاؤں سے جیسے میرے زمیں ہی نکل گئی

تجھ سے بچھڑ کے آنکھ میں آنسو اتر گئے
تیرا خیال آیا طبیعت بہل گئی

صحرا ہوئے وہ دل جنہیں قربت نہیں ملی
جیسے گھٹا برسنے سے پہلے ہی ٹل گئی

یہ تیز آندھیوں سے محبت کا ہے صلہ
بنیاد یا جلایا تو میں خود ہی جل گئی

کیسے کھلاؤں پھول یہاں اعتبار کے
سب رنگ بے وفا ہیں ترے لالہ زار کے

آیا ہے سنگ لے کے وہی میرے سامنے
رکھا تھا جس کو شیشہ دل میں اتار کے

اب وہ نظر کی طرح مری چشم غم میں ہیں
اب ڈھونڈتا ہوں لمحے شب انتظار کے

میں آگیا ہوں شہر میں تیرے خطا معاف
کہنے میں آگیا تھا دل بے قرار کے

جو شخص اپنی ذات سے بیگانہ ہے حمید
دیکھے گا خاک حوصلے مجھ غم نگار کے

توقیر ملیزئی

کاغذوں پر دیے جلاتے رہے
خون لفظوں کو ہم پلاتے رہے

روشنی میں بجھے بجھے تھے حریف
ہم اندھیروں میں جگمگاتے رہے

کتنا مشکل تھا آدمی بننا!
لوگ خود کو خدا بناتے رہے

لوگ پتھر کے، شہر پتھر کا
ہم بھی لعل و گہر لٹاتے رہے

دائروں کی فضائیں تھیں محدود
ہم شعاؤں میں جھلملاتے رہے

تاسی پریتم

مری سچائیوں کے بوجھ سے جو دار گھلتی ہے
تو گردن محتسب کی پھر سر دربار گرتی ہے

یقیناً پوچھتا نزدیک گر یہ آسماں ہوتا
مرے ہی آشیاں پہ برق کیوں ہر بار گرتی ہے؟

لپٹ جاتے ہیں پھر بے چہرگی کے دیو جسموں سے
ہنر کے ہاتھ سے جو عظمت معیار گرتی ہے

نکل خوش فہمیوں سے جذبہ تعمیر زندہ کر!
کہ سایہ بھی نہیں رہتا اگر دیوار گرتی ہے

یہ کیسا بے اماں شہر ستم آثار ہے، جس میں
کہیں گرتے ہیں سر تاسی کہیں دستار گرتی ہے

تحسین فراقی

ترے فراق میں دل شعلہ چنار ہوا
برنگ زخم کھلا، تحفہ بہار ہوا

شعاعِ مہر سے نکلی تو دل کو چیر گئی
کماں سے تیر جو نکلا جگر کے پار ہوا

رہا ہمیشہ زمانہ یونہی ضعیف آزار
جو پاپیادہ ہوا، اس پہ یہ سوار ہوا

تم اس کے ہو کے بھی کیوں اس کے ہو نہیں پائے
سوال مجھ سے یہی ایک بار بار ہوا

جاوید شاہین

کچھ حقیقت ہے یا گماں تک ہے
پوچھ رنجش اسے کہاں تک ہے

بات دل میں رچے تو ہے اپنی
لفظ اپنا فقط زباں تک ہے

خوف میں کیوں ہیں دوسرے موسم
زرد رنگت ابھی خزاں تک ہے

تیرگی میں اتر کے دیکھ ذرا
روشنی کی چبھن کہاں تک ہے

جتنی کشتی بس اتنا ہے دریا
اور طوفان بادباں تک ہے

یہ سفر در سفر جو ہے شاہیں
رائیگاں سے یہ رائیگاں تک ہے

جاذب قریشی

صحرا میں کوئی سایہ دیوار تو دیکھو
اے ہم سفر دھوپ کے اس پار تو دیکھو

جلتا ہوں اندھیروں میں کہ چمکے. کوئی چہرہ
موسم ہیں عداوت کے مگر پیار تو دیکھو

کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دعائیں
تم اپنے شکستہ در و دیوار تو دیکھو

دفتر کی تھکن اوڑھ کے تم جس سے ملے ہو
اس شخص کے تازہ لب و رخسار تودیکھو

کل شام وہ تنہا تھا سمندر کے کنارے
کیا سوچ رہے ہو کوئی اخبار تو دیکھو

دروازہ جاں بند رہے گا تو جلوگے
اک آگ بچھی ہے پس دیوار تو دیکھو

آنکھیں ہیں کہ زخمی ہیں بدن ہے کہ شکستہ
آشوب سفر ہوں مری رفتار تو دیکھو

خود اپنی ہی پرچھائیں میں سمٹو گے کہاں تک
سورج کا دہکتا ہوا انگار تو دیکھو

اس دشت میں سیلاب مجھے چھوڑ گیا ہے
مجھ میں مری تہذیب کے آثار تودیکھو

جاوید راہی

صدیوں میں فاصلوں کو گھٹایا نہ جاسکا
دھرتی کو آسماں سے ملایا نہ جاسکا

دشوار اس قدر تھیں سفر کی اذیتیں
ہمراہ میرے دھوپ میں سایا نہ جاسکا

باد ستم شعار کی بیعت کے باوجود
ہم سے کوئی چراغ بجھایا نہ جاسکا

اپنوں نے ہر خوشی مرے قدموں میں ڈال دی
دل سے مگر وہ درد پرایا نہ جاسکا

کاٹیں ہزار بار رگیں وقت کی مگر
اک لمحہ بھی گرفت میں لایا نہ جاسکا

انسانیت سے گہرے مراسم تھے اس قدر
دشمن کو بھی نظر سے گرایا نہ جاسکا

یہ ہاتھ پاؤں اگرچہ تھے کشتیوں جیسے
ملے ہیں کرب بھی ہم کو سمندروں جیسے

کھلا ہے دشتِ تمنا میں اک گلاب ایسا
تمام رنگ ہیں آنکھوں میں تتلیوں جیسے

یہ کون دست و گریباں رہا ہے موجوں سے
یہ کیسے نقش ہیں پانی پہ انگلیوں جیسے

ہم ایک تازہ شجر تھے مگر زمانے میں
ملے ہیں لوگ پرانی حویلیوں جیسے

ہوا ہی لوٹ کے آئی نہ اس طرف ورنہ
کھلے ہوئے تھے بدن اپنے کھڑکیوں جیسے

بچھا کے ترچھی لکیریں زمین پر راہی
فلک بناتا ہوں اپنی ہتھیلیوں جیسے

جمشید مسرور

یاد کے دریچوں میں بارشوں کے منظر ہیں
کس نگر کی باتیں ہیں کن رتوں کے منظر ہیں

اجنبی دیاروں میں شوق دید لے جاؤ
کچھ نہیں تو ہر جانب دلبروں کے منظر ہیں

عمر ہو گئی لیکن اب بھی ہیں تعاقب میں
اس گلی سے آگے بھی تتلیوں کے منظر ہیں

دل کی نم زمینوں پر چل رہے ہیں ہم کب سے
دور زرد پیڑوں پر آندھیوں کے منظر ہیں

دور سے دمکتا ہے سمگوں بدن اس کا
اور قرب میں سارے نکہتوں کے منظر ہیں

کیا ہر ایک جانب سے چل کے خود تک آیا ہوں
میرے چار سو جمشید راستوں کے منظر ہیں

جواز جعفری

انہیں کرتا ہے جانے کون سپلائی کہاں سے؟
کہ آنکھوں میں چلی آتی ہے بینائی کہاں سے؟

چلو خورشید کا نعم البدل ڈھونڈیں کہ نادر
یہ انگارہ لٹائے گا توانائی کہاں سے؟

پلٹ ڈالا اچانک جنگ کا پانسہ عدو نے
کہو لشکر کرے آغاز پسپائی کہاں سے؟

ندی کے پاؤں میں خار تھکن کے ٹوٹتے ہی
چلی آتی ہے روئے آب پر کائی کہاں سے؟

اگر تھی صدر دروازے پہ چشم قفل بیدار
تو پھر یہ شہر میں گھس آئے بلوائی کہاں سے؟

ترے معتوب تو بے دست و پا کٹھ پتلیاں ہیں
ہمیں معلوم ہے آتی ہے مہنگائی کہاں سے؟

جعفر شیرازی

یہ کیا کہ خستگی جان وتن زیادہ ہے
ہوا چلی تو ہے لیکن گھٹن زیادہ ہے

بڑا عجیب سفر ہے کسی کی یادوں کا
کہ جسم ٹوٹ رہا ہے تھکن زیادہ ہے

گلاب حسن کی خوشبو کی اک مثال سہی
جمال یار کی لیکن چبھن زیادہ ہے

خدا رکھے تجھے تجھ کو نگاہ بد نہ لگے
کہ بات بات میں اب بانکپن زیادہ ہے

گھر اس کا گرچہ یہاں سے زیاں دور نہیں
سفر جو سامنے اب ہے کٹھن زیادہ ہے

ہیں ایک سے بھی زیادہ قیامتیں جیسے
وہ پھول پھول جبی پہ شکن زیادہ ہے

مقام عشق میں یہ بھی قبول ہے جعفر
وہاں ہوں میں جہاں دیوانہ پن زیادہ ہے

یہ جس میں رہتے ہیں ہم یہ نگر کسی کا ہے
شجر کسی کے ہیں لیکن ثمر کسی کا ہے

جہاں کہیں وہ گیا ہجرتوں میں میں ہی رہا
میں کر رہا ہوں جسے طے سفر کسی کا ہے

وہ انتشار کسی کو خبر کسی کی نہیں
زمیں کسی کی ہے اور شور و شر کسی کا ہے

پیام دیتا ہے اس یار بے وفا کے مجھے
یہ دل ہے میرا مگر نامہ بر کسی کا ہے

میری نگاہ میں ہے اور وہ اس میں رہتا ہے
جو ایک چاند سا گھر ہے وہ گھر کسی کا ہے

کس عہد گم گمی میں جئیں گے ہم جعفر
یہاں کسی کی ہے دستار سر کسی کا ہے

جمال مشرقی | حامد محمود

موسم شناسیوں پہ مجھے جس کی ناز ہے — آساں جب سے دھواں ہونے لگا
دمساز بھی وہی ہے وہی کینہ ساز ہے — ختم سر کا سائباں ہونے لگا

اک خوش مزاج شخص کی چٹکی میں تھا گلاب — جب چراغ آرزو بجھنے کو تھا
لیکن لہو سے تر مرا دست دراز ہے — آنکھ سے دریا رواں ہونے لگا

گنتا رہا ہے وہ بھی مرے دل کی دھڑکنیں — کیا محبت کا نتیجہ ہے یہی
شام و سحر سے میری کہاں بے نیاز ہے — خود پہ بھی اس کا گماں ہونے لگا

دیتا ہے التفات کا زہراب بے طلب — اس کے آنے سے لگا ہے یوں ہمیں
ایسا بھی ایک شخص بہت دلنواز ہے — جیسے ویرانہ مکاں ہونے لگا

مجھ سے تعلقات بھی رکھتا ہے استوار — رفتہ رفتہ آنکھ میں اترا کوئی
دشمن سے میرے اس کی مگر ساز باز ہے — اور دل کا میہماں ہونے لگا

آئینہ ریزے ریزے ہیں دل کے مرے جمال — خامشی میں گفتگو ہونے لگی
کیا شہر دوست میں کوئی آئینہ ساز ہے — کون میرا ہم زباں ہونے لگا

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

پیٹ کی خاطر پھرے سنسار میں
زندگی یوں کٹ گئی بیکار میں

رات لوری دے رہی ہے چاند کو
چاند الجھا ہے خیالِ یار میں

بستیاں تو بن رہی ہیں چاند پر
آدمیت گر رہی ہے غار میں

پھول پر گرتے ہی زخمی ہو گیا
شاد تھا جو آگ کے گلزار میں

جھانکتی رہتی ہے ہر دم کیوں مجھے
کیا دراڑیں پڑ گئیں دیوار میں

ظلمتیں جب آستینوں میں پلیں
روشنی پھولے پھلے اغیار میں

جو کہو وہ تول لو پہلے حنیف
کاٹ ہوتی ہے زباں کی دھار میں

حنیف نجمی

جو دوسروں پہ بھروسہ زیادہ کرتے ہیں
خودی سے اپنی وہ کم استفادہ کرتے ہیں

یہاں کسی سے عمل کی امید کیا کیجئے
یہاں کے لوگ تو باتیں زیادہ کرتے ہیں

یہ لوگ کتنے منافق ہیں جس سے نفرت ہو
اسی کی مدح سرائی زیادہ کرتے ہیں

یہ سازشوں کی ڈگر ہی عجیب ہے ورنہ
سفر ہو کوئی بھی ہم پا پیادہ کرتے ہیں

عجیب بات ہے بے فیض تھا جو جیتے جی
اب اس کی قبر سے لوگ استفادہ کرتے ہیں

وہ جن کے پاس نیا کچھ نہیں ہے کہنے کو
جو کہہ چکے ہیں اسی کا اعادہ کرتے ہیں

یہ زندگانی تو سچ مچ انہیں کی ہے نجمی
جو تار تار ہوس کا لبادہ کرتے ہیں

خادم رزمی

پہنچ کر فیصلے پر گر دوبارہ سوچتا ہے تو
تو پھر کہنا اسے اپنا خسارہ سوچتا ہے تو

مرا تیرا بہم ہونا بہت مشکل ہے کچھ یوں بھی
کہ میں گرداب دریا اور کنارہ سوچتا ہے تو

خدا تو ہے، مگر تیرا پنپنا ہے بہت مشکل
بجز اپنے اگر دوجا سہارا سوچتا ہے تو

کھلے کچھ اس مسلسل بارش غم کا بھی اب ہم پر
بھلا تو خیر مانا سب ہمارا سوچتا ہے تو

گرفت آسماں سے سر چھڑا پیروں کو دھرتی سے
اگر ان سے الگ اپنا ستارہ سوچتا ہے تو

رسائی کس طرح ہو گوہر مقصود تک تیری
سمندر میں اتر کر بھی کنارہ سوچتا ہے تو

جو سیدھی صاف باتیں بھی سمجھ پاتا نہیں تیری
اسی سے گفتگو میں استعارہ سوچتا ہے تو

مسافر ہے سلگتے دشت کا اور اس پہ بھی رزمی
مغنی، چاند شب، دجلہ شکارا سوچتا ہے تو

حباب ہاشمی

کچھ اس طرح سے وہ محفل میں دیکھتا ہے مجھے
کہ جانتے ہوئے انجان لگ رہا ہے مجھے

بہت قریب سے دیکھا تو اپنا سایہ ہے
وہ ایک شخص جو آوارہ لگ رہا ہے مجھے

فریب مجھ کو خدارا نہ دے بنام وفا
ترے خلوص کا اندازہ ہو چکا ہے مجھے

خدا گواہ کہ میں اپنے آپ میں گم ہوں
مرا وجود بھی ہر لحظہ ڈھونڈتا ہے مجھے

فسردہ چہرے پہ ہے کتنے ماہ و سال کی گرد
اب آئینہ بھی تو حیرت سے دیکھتا ہے مجھے

فقیر بن کے چلا ہوں حباب شہر کی سمت
سگ ضعیف بھی رہ رہ کے گھورتا ہے مجھے

حفیظ طاہر　　　　　　　　　　　　　　　　حیدر قریشی

ہوا گلاب رخ یار کو جلا ہی نہ دے　　　　نہ کسی کے دم نہ عصا میں ہے
خیالِ ترکِ تمنا اسے تباہی نہ دے　　　　جو کمال تیری ادا میں ہے

میں اپنی آنکھ کو پلکوں میں سینت رکھتا ہوں　　　　اسے کون ہے جو بجھا سکے
جو میرے دل میں چھپا ہے اسے سنا ہی نہ دے　　　　یہ چراغ اپنی ہوا میں ہے

وہ میرا دشمن جاں شکر ہے خدا تو نہیں　　　　جو اثر ہے اس کی نگاہ میں
چلے جو بس تو مری سانس کو ہوا ہی نہ دے　　　　نہ دوا میں ہے نہ دعا میں ہے

نسیم صبح سے ڈرتا ہے زرد رو پتا　　　　جو مزا ہے میرے سوال میں
گلابِ سرخ کی خوشبو اسے مٹا ہی نہ دے　　　　کہاں اس کے دست عطا میں ہے

چلا گیا ہے تو مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا　　　　نہ زمیں پہ ہے نہ فلک پہ ہے
بھرم جنون کا رکھ لے اسے صدا ہی نہ دے　　　　مری روح جیسے خلا میں ہے

حمید ہمدم

بچھڑ کے اس سے مجھے اس کی جستجو بھی نہیں
مری حیات کی محفل میں ہاؤ ہو بھی نہیں

فریب دے گیا اپنا بنا کے وہ مجھ کو
اب ایسے شخص سے ملنے کی آرزو بھی نہیں

زمانہ سازی دنیا اسی کو کہتے ہیں
ہے جس سے قرب بہت اس سے گفتگو بھی نہیں

عجب ہے حسن کا انداز مجھ سے ملنے کا
میں سرفراز بھی ہوں اور سرخرو بھی نہیں

خیال و خواب کے عالم میں گم ہوا ہوں میں
مرے شعور کو احساس رنگ و بو بھی نہیں

فضول شکوہ جو رو ستم کیا میں نے
وہ مجھ پہ رحم کرے ایسی اس میں خو بھی نہیں

یہ معجزہ ہے مرے جذبہ محبت کا
وہ میرے ساتھ ہے ہمدم جو روبرو بھی نہیں

نظر میں گردش دوراں کی داستاں بھی نہیں
زمیں بھی میری نہیں میرا آسماں بھی نہیں

ہوائے تند ہے طوفان برق و باراں ہے
قضا کے ہاتھ سے محفوظ آشیاں بھی نہیں

فسانہ غم دل میں کہوں تو کس سے کہوں
کہ بزم غیر میں اب کوئی ہم زباں بھی نہیں

جھلس نہ جائے بدن دھوپ کی تمازت سے
کہ سر چھپانے کو بستی میں سائباں بھی نہیں

میں ایک حلقہ ظلمت ہوں بزم ویراں کا
وہ شمع کشتہ ہوں جس میں کہ اب دھواں بھی نہیں

اٹھائے پھرتاہوں میں بار زندگی ہمدم
مرا وجود کسی پر مگر گراں بھی نہیں

خاطر غزنوی

بال چاندی روش جوانی کی
ہم نے صحرا میں کشتی رانی کی

دل کو مندر بنالیا ہم نے
خوب کعبے کی پاسبانی کی

ڈھونڈیں سرابیاں سرابوں میں
پائی گہرائی ان میں پانی کی

یادیں بیتے عذاب ہیں لیکن
چاشنی ان میں ہے کہانی کی

ان کی خوشیوں کو ہر خوشی دے دی
ہم نے ہر غم کی میزبانی کی

آنکھیں جن میں کنول خوشی کے کھلے
اب وہ جھیلیں ہیں بہتے پانی کی

بن گئیں زندگی کا سرمایہ
سب کی سب لغزشیں جوانی کی

زندگی بھر پتہ نہیں پایا
کیا حقیقت ہے زندگانی کی

خون انساں کب جہاں میں اس قدر ارزاں نہ تھا
آدمی کو آدمی رہنا کبھی آساں نہ تھا

یہ زمیں میری نہ تھی اور آسماں میرا نہ تھا
ذات میں اپنی نگر میں اس قدر تنہا نہ تھا

ساعتیں اکثر وہ آئیں اپنا جب کوئی نہ تھا
محفل یاراں میں اک بھی بہر دلجوئی نہ تھا

دھوپ تو پھیلی تھی ہر سو پر کوئی منظر نہ تھا
نور باہر تو بہت تھا ' روح کے اندر نہ تھا

خواب سب اپنے تھے میرے' غیر کا سائل نہ تھا
میں کبھی مانگی ہوئی تعبیر کا قائل نہ تھا

کھیت میں نے آفتابوں کا کبھی بویا نہ تھا
میری دنیا تھی اندھیری پھر بھی میں کھویا نہ تھا

خالد احمد

بزم یاراں میں بھی خاموش رہے
زندگی بھر، ہمہ تن گوش رہے

حلقہ در گوش تھے ضمیر بردوش
یار آسودہ آغوش رہے

ہم پس پردہ فردا اترے
اور ہر حال میں روپوش رہے

حسن آغاز تصور ہو جہاں
عشق اعجاز تن و توش رہے

راس آئی تری بے پروائی
زود غم، زود فراموش رہے

جان تک ہار گئے اہل جنوں
ہم اسیر ہوس ہوش رہے

آگہی خانہ بر انداز رہی
اہل غم، صید لب و گوش رہے

گل کوتاہ بیانی نہ کھلا
غرق حیرت ترے مدہوش رہے

بند آنکھوں ترا دیدار کیا
رہن رحمت ترے کم کوش رہے

لب پہ آہیں یہ کراہیں نہ رہیں
ہم گراں خواب و گراں گوش رہے

بے زبانوں نے بھی لب کھول دیئے
تجھ کو تکتے ترے بے نوش رہے

خالد احمد

ان سرابوں میں کہاں پانی تھا حشر برپا تھا کنارِ مژگاں
موجۂ ریگ رواں پانی تھا آنکھ پتھر تھی بیاں پانی تھا

پیاس تاحد نگہ پھیلی تھی ہم وہاں سمت نما تھے خالد
اور تا حد گماں پانی تھا جس جگہ نقش نشاں پانی تھا

دائرہ دائرہ سورج دیکھے
جھیل میں شعلہ فشاں پانی تھا

ہم تھے سرمائے کے سائے سائے
وہیں جھلمل تھی جہاں پانی تھا

پھول اڑتے تھے کہ پر جلتے تھے
آگ پانی تھی ، دھواں پانی تھا

قہقہے تھے کہ چمکتی موجیں
رات گلیوں میں رواں پانی تھا

حسن پر سایہ فگن تھے بادل
عشق پر سایہ کناں پانی تھا

کائی اگ آئی تھی دیواروں پر
سر سے گزرا تو کہاں پانی تھا

خالد ریاض خالد

ہو سکے تو بے بسی کا میری منظر دیکھنا
آنکھ میں اترا ہوا ہے اک سمندر دیکھنا

گر حصار ذات سے آنا ہے باہر دوستو!
دوسروں کو بھی کبھی اپنے برابر دیکھنا

دل کے آئینے اگر تخریب کی زد میں رہے
آئینہ سازوں کے ہاتھوں میں بھی پتھر دیکھنا

اپنے گھر میں جو سکوں ہے دو جہانوں میں نہیں
جب چلے آؤ کبھی امبر سے ہو کر، دیکھنا

اب تو خالد اس کے در میں کوئی روزن بھی نہیں
کس قدر مشکل ہے اب زنداں سے باہر دیکھنا

خاور چوہدری

کبھی تجھے کبھی دل کو پکار لیتا ہوں
شب فراق کو یوں بھی نکھار لیتا ہوں

غریب شہر تھا لیکن، نہ اس قدر مفلس
کہ اب تو اشک بھی میں مستعار لیتا ہوں

دل ایک آئینہ اس نو بہار ناز کا ہے
اسی سے جلوہ دیدار یار لیتا ہوں

میں تیری یاد کی وارفتگی میں بے خود ہوں
جو ہوش آئے تو تجھ کو پکار لیتا ہوں

میں رہگزار وفا میں بکھر چکا ہوں مگر
ترے خیال سے کچھ اعتبار لیتا ہوں

خلیل احمد

لے کے اٹھے گا پرچم معقول
صحف منقول کو لے بیٹھے گا

لفظ تشکیک بن کے اترے گا
فکر مقبول کو لے بیٹھے گا

ایک سیلاب بن کر آئے گا
شہر معمول کو لے بیٹھے گا

وہ ہے ، تسلیم، علت اول
کہنہ معلول کو لے بیٹھے گا

کوئی ایسی دلیل لائے گا
وجہ مدلول کو لے بیٹھے گا

ہوگا شامل بطور شاہد پر
نفس مشمول کو لے بیٹھے گا

تخت پر بیٹھ جائے گا خود بھی
ساتھ معزول کو لے بیٹھے گا

قتل ہونا تو کوئی بات نہیں
جذب مقتول کو لے بیٹھے گا

ساری باتیں وہ بھول جائے گا
اک مری بھول کو لے بیٹھے گا

آمد رشک مبارک ، اے دل!
ابر ہے، دھول کو لے بیٹھے گا

خورشید افسر بسوانی

پھینک کر میں بھی کوئی فکر کا پتھر دیکھوں
اور پھر دور سے اس پیڑ کا منظر دیکھوں

قتل گاہوں کی جگہ اب نئے دفتر دیکھوں
فائلیں کھولوں تو کاغذ پہ دھرے سر دیکھوں

جانے کب میری تمنائیں مجسم ہو جائیں
اپنی خواہش کے مطابق کوئی پتھر دیکھوں

ایک کرب ، ایک گھٹن لفظوں کی تہذیب میں ہے
کیوں نہ اس غار سیہ سے میں ابھر کر دیکھوں

پھر چلا سرو خراماں مرے دل کو چھونے
پھر لچکتی ہوئی اک شاخ صنوبر دیکھوں

شاید اس طرح میں آجاؤں زمانے سے قریب
آئینہ اپنے سرہانے سے ہٹا کر دیکھوں

زندگی ہے تو مقامات جنوں اور بھی ہیں
اب نہ اس راہ گزر میں تجھے افسر دیکھوں

خواجہ احسن الدین

یاد آجائے گا پھر سے وہ زمانہ اپنا
کاش مل جائے کوئی دوست پرانا اپنا

سن لے صیاد میرا نام لکھا ہے جس پر
میں نہ چھوڑوں گا ترے جال میں دانہ اپنا

سوچتا ہوں مری چاہت کے اثر سے مجھ کو
بھول جائے گا کبھی وہ بھی بھلانا اپنا

پتھروں سے ہے محبت ہمیں ورنہ کب کا
اک اشارے پہ ہی ہو جاتا زمانہ اپنا

اتنے سادہ بھی نہیں ہم مگر ان کی خاطر
اپنے ہاتھوں سے لیا ہم نے نشانہ اپنا

در بدر ہونے کی عادت سی ہوئی جاتی ہے
راس آتا نہیں کوئی بھی ٹھکانہ اپنا

خون نکلتا ہے تو پھر خشک نہ ہونے پائے
آؤ احسن لکھیں اک اور فسانہ اپنا

خواجہ رحمت اللہ جری

کیوں نہ چٹان کے سینے سے کوئی جو پھوٹے
شب تاریک سے ہی نور کے جگنو پھوٹے

کھردرے پن پہ بہت ایڑیاں رگڑیں میں نے
تب کہیں جسم کی مٹی سے یہ آنسو پھوٹے

دست پرکار گھمایا ہے جو دل پر رکھ کر
دیکھیے فیض کے چشمے ہیں کہ ہر سو پھوٹے

بارہا جس کا عقیدت سے کرے گا تو اطواف
اس کے جیسی ہی ترے پاس سے پھر خو پھوٹے

میں نے تشہیر کا روزہ تو نہیں رکھا ہے
کس طرح مجھ سے مری فکر کی خوشبو پھوٹے

خوشی کی بات جو حد سے نکل گئی ہوگی
وہ میری آنکھ کے اشکوں میں ڈھل گئی ہوگی

وہ جس کو دھوپ کے بازو نہ کر سکے قابو
خود اپنے خوف کے سائے میں پل گئی ہوگی

جو رہ میں، میں نے کھڑی کی ہے جس کی دیوار
یہ بات چلتی ہواؤں کو کھل گئی ہوگی

جو خیرہ کر گئیں آنکھوں کو ایک لمحے میں
زمیں کے ماتھے پہ وہ رات مل گئی ہوگی

جو چل رہی تھی ہوا کل میرے مخالف میں
وہ آج راستہ اپنا بدل گئی ہوگی

ڈاکٹر خیال امروہوی

کتنے بے قاعدہ قانون کے پابند ہوئے
جرم یہ ہے کہ نہ کیوں جیل میں ہم بند ہوئے

کچھ وہ البرز شکن جو رہے دنیا میں حقیر
کچھ وہ بونے جو غلامی میں بھی الوند ہوئے

بے ہنر چاٹ گئے اہل ہنر کا ورثہ
گویا محتاج یہاں صرف "ہنر مند" ہوئے

کتنے سینوں پہ خوشامد نے لگائے تمغے
کتنے پابوسیٔ سرکار سے خرسند ہوئے؟

کیسے افکار و نظریات کہاں سوچ کی لو
فکر و تفہیم کے ابواب ہی جب بند ہوئے

اب نہ زنجیر نہ زنداں نہ عذابوں کا ورود
کتنی خوبی سے مشاہیر کے منہ بند ہوئے ؟

درشہوار فیروز

یوں مرے ہاتھوں نئے باب ہنر کھلنے لگے
اور ہی دنیا کے جیسے مجھ پہ در کھلنے لگے

زخم دل اب مندمل ہونے کو ہیں عرصے کے بعد
پھر نہ پائیں گے جو یہ بار دگر کھلنے لگے

منزلوں کا شوق دل سے دور ہوتا جائے گا
دو گھڑی رکنے پہ گر رخت سفر کھلنے لگے

یہ ہمیں ساحل سے تم نے کس طرح آواز دی
پاؤں سے لپٹے ہوئے سارے بھنور کھلنے لگے

جانتی تو ہوں اسے لیکن سمجھ پائی نہیں
رفتہ رفتہ دھیرے دھیرے کیا خبر کھلنے لگے

اب تلک تو ریت ہی مٹھی میں تھامے میں رہی
پانیوں کے بیچ اتری تو گہر کھلنے لگے

جاتے جاتے کہہ گیا وہ لوٹ کر آؤں گا میں
گھر کے دروازے ہر اک آواز پر کھلنے لگے

ذوقی مظفرنگری

احساس کی تصویر کو آواز ملی ہے
تدبیر سے تقدیر کو آواز ملی ہے

آزادیِ اظہار کی تہذیب کے صدقے
آزردہ و دل گیر کو آواز ملی ہے

اپنے بھی پرائے بھی سبھی بول رہے ہیں
ہر مائل تقریر کو آواز ملی ہے

جب خون کے دریا میں گرے سینکڑوں سورج
تب صبح کی تنویر کو آواز ملی ہے

کیونکر نہ ہو بیدار ضمیروں کی سماعت
فریاد کی تاثیر کو آواز ملی ہے

جس خواب میں دیکھے تھے کبھی گونگے مناظر
اس خواب کی تعبیر کو آواز ملی ہے

اب ہوگی نئے دور کی تاریخ مرتب
اب جذبہ تحریر کو آواز ملی ہے

ذوقی کے لبوں پر ہی نہیں شرح تمنا
ہر خامہ تفسیر کو آواز ملی ہے

ذیشان اطہر

ابر چھایا ہے بوندا باندی ہے
ایسے موسم میں دل کی چاندی ہے

بولنے کا جواز پیدا کر
جب خدا نے تجھے زباں دی ہے

اس نے مجھ پر ہی تیر پھینکے ہیں
میں نے جس ہاتھ میں کماں دی ہے

سر پہ قرآن رکھ کے نکلا ہوں
ظلم کے خوف سے اذاں دی ہے

اس کو احساس کمتری کیسا
رب نے جس کو شفیق ماں دی ہے

وار کرنے میں پہل کرتا وہ
اتنی مہلت اسے کہاں دی ہے

چور خود اس کے دل میں تھا ذیشان
جس نے دیوار جان پھاندی ہے

رب نواز مائل

بے کیف سی مشکلوں سے ہراک اس کا نشاں ہو
دنیا میں اگر زیست نہ ہم سے بھی جواں ہو

دن جیسے تھکانے کے لئے تھا یہی دیکھا
اب شب ہی سے اچھا مجھے ہرلحہ جاں ہو

اس حسن دل آرا سے کہاں خواب بھی پائے
اس عشق سے میرے کہیں اس کا بھی بیاں ہو

پہنائی عالم بھی جہاں ایک قدم ہو
آگے مرے ایسا ہی نہ اک اور جہاں ہو

اک چہرہ محزوں سے مری نیند اڑی ہے
کیا ہوگا جو مائل یہی پل پل کا سماں ہو

آئینے جہاں ہوں در و دیوار میں مائل
مرجھایا ہوا چہرہ کوئی بھی نہ وہاں ہو

رحمان حفیظ

عشق میں کیا فائدہ ہونا تھا پر ہوتا گیا
میں جہان اہل دل میں معتبر ہوتا گیا

رفتہ رفتہ ہلکے رنگوں سے بھی دلچسپی ہوئی
میں بڑا ہوتا گیا اور خوش نظر ہوتا گیا

ہر نئی تحقیق سے اٹھے کئی تازہ سوال
آدمی فکر خبر میں بے خبر ہوتا گیا

جتنے بھی رشتے تھے مرہون فریب فکر تھے
جس مکاں میں دل لگایا اپنا گھر ہوتا گیا

ایک دنیا تھی ہمارے بس میں دامن کے سوا
جتنا پھیلایا یہ اتنا مختصر ہوتا گیا

آخرش راس آگئی مجھ کو یہی بے چارگی
میں نظر انداز ہو کر خود نگر ہوتا گیا

رشک خلیلی

ظلمت سے روشنی کو نمایاں کیا گیا
اس طرح اہتمام چراغاں کیا گیا

آئی کبھی بہار تو آئی کبھی خزاں !!
گلشن میں بوئے گل کو پریشاں کیا گیا

ہر آئینے کو اک نئے پتھر سے توڑ کر
اہل نظر کو اور بھی حیراں کیا گیا

سورج سے مجھ کو لینا پڑی روشنی کی بھیک
ایک ایک ذرہ کیوں نہ درخشاں کیا گیا

فکر و نظر کے زاویے تبدیل ہوگئے
کچھ یوں تعین رخ جاناں کیا گیا

جتنے بھی رنج و غم ملے سب سہ لئے گئے
بس یہ علاج گردش دوراں کیا گیا

ٹھوکر تو ابتدائے سفر میں لگی تھی ایک
ہم کو تمام عمر ہراساں کیا گیا

پیش آئے بار بار جنوں خیز مرحلے
ہم سے مگر نہ چاک گریباں کیا گیا

جتنے بھی حادثے پیش آئیں انہیں یاد رکھیں
دل کو بیتاب ہی رکھنا ہے تو برباد رکھیں

میں تو ہر سرحد امکاں سے گزر سکتا ہوں
اہل دنیا جو مجھے فکر سے آزاد رکھیں

محو حسرت ہیں ہمیں اتنی بھی فرصت ہے کہاں
یاد ہر خواہش ناکام کی رو داد رکھیں

اس توقع پہ بڑھائے ہیں مراسم میں نے
دوست احباب مرے بعد مجھے یاد رکھیں

آپ تخریب میں تعمیر کے قائل ہیں اگر
غم دوراں پہ غم زیست کی بنیاد رکھیں

عمربھر اک یہی نکتہ نہ سمجھ میں آیا
ہم کسے شاد رکھیں اور کسے ناشاد رکھیں

مرنے والوں کو یونہی یاد کیا کرتے ہیں
ذہن میں چند مہ و سال کے اعداد رکھیں

آپ انساں ہیں تو ظاہر بھی ہو انساں ہونا
قہقہہ لب پہ رکھیں یا کوئی فریاد رکھیں

رحمان خاور

عکس کی طرح دیکھتا تو نہیں
ہر کوئی میرا آئینہ تو نہیں

موت تو اک یقیں سہی لیکن
زیست بھی کوئی واہمہ تو نہیں

داستاں تیری جس میں شامل تھی
تو نے وہ واقعہ سنا تو نہیں

دوسروں کی یہ ترجمانی کیا
کوئی مجھ میں چھپا ہوا تو نہیں

خامشی پر نہ اس کی حرف آجائے
بات کرتا ہے بولتا تو نہیں

کیا پڑھوں اتنے سارے لفظوں کو
آپ نے خط میں کچھ لکھا تو نہیں

کئی دن سے اسے نہیں دیکھا
دیکھنا اس کو کچھ ہوا تو نہیں

اتنے حیران کیوں ہو اے خاور
رات کا خواب کچھ نیا تو نہیں

رضا عباس رضا

جب کوئی کرتا ہے زخمی روح تک
تب اترتی ہے برائی روح تک

میں ہوں اک اجڑی حویلی کی صدا
کیا کوئی پہنچے گا میری روح تک

اک ہنسی ملتی ہے پر بے نام سی
جب اتر جاتا ہے کوئی روح تک

آشنا بھی اجنبی ہونے لگے
چھا گیا جب وہ اناڑی روح تک

اب وہ اک اشک ندامت بھی نہیں
اک سمندر تھا جو پیاسی روح تک

ایک اچھے شعر کی صورت رضا
میں اتر جاؤں گا اس کی روح تک

رضیہ شمع

اسے پتہ ہے وہ جانتا ہے خزاں رتوں کو گلاب کرنا
وہ زرد پتوں میں رنگ بھرنا گلوں کو نظر شباب کرنا

وہ جھیل کے گہرے پانیوں میں بھی ایک کنکر سا پھینک دینا
نگاہ کو زیرِ آب کرنا سکوت میں اضطراب کرنا

بہار کی نرم آہٹوں کا وہ چوم لینا چمن کا چہرہ
وہ دھیرے دھیرے خطاب کرنا کلی کلی کو گلاب کرنا

وہ جانتا ہے کہ اس کی بانہوں میں رک چکا ہے گلاب موسم
وہ روک لیتا ہے ایک موسم جو چاہتا ہے عتاب کرنا

اسے پتہ ہے وہ دیکھ لیتا ہے کہکشاؤں کا ہر ستارہ
کسی کو بوس جبین کرنا کسی کو روئے شباب کرنا

یہ جانے کیسی ہوا چلی ہے ہوائیں مسرور ہوگئیں ہیں
وہ جانتی ہیں حیا کا آنچل انہیں کو ہے بے نقاب کرنا

یہ ریگ زاروں نے اپنے سینوں میں خنک موسم بسا لئے ہیں
تو جب بھی آئے اے ابر باراں تو بارشیں بے حساب کرنا

رضیہ سلطانہ

ملے یونہی زندگی کا ہر اک مرحلہ ہوا
ہر ہر قدم پہ ایک نیا سانحہ ہوا

وہ دور تھے تو کتنی طبیعت اداس تھی
وہ پاس آگئے تو بڑا حوصلہ ہوا

جس کی تلاش تھی وہ کہاں راہ مل سکی
پامال شہر جاں کا ہر اک راستہ ہوا

ان سے ملے تو ایک زمانہ گزر گیا
برسوں ہوئے کہ ختم ہر اک سلسلہ ہوا

اس انجمن کی بات وہیں ختم ہوگئی
بس بھول جائیں یہ بھی کوئی مسئلہ ہوا

نزدیک آکے اور بھی وہ دور ہوگئے
چاہا ہزار ختم کہاں فاصلہ ہوا

رضیہ تمام عمر مٹی جس کے واسطے
اس بزم دلبراں میں کہاں داخلہ ہوا

رفعت سلطان

ہوں مانوس گلستانوں سے جن کے دل میں درد نہیں ہے
ڈر لگتا ہے ویرانوں سے بدتر ہیں وہ حیوانوں سے

کیسا شکوہ پیمانوں سے راز محبت کیا ہے رفعت
زہر ملا ہے میخانوں سے پوچھوں گا میں دیوانوں سے

اب تو دل کو بہلاتے ہیں
پیار کے فرضی افسانوں سے

ارزاں قتل ہے انسانوں کا
رسم چلی یہ انسانوں سے

ظالم کو ظالم کہتے تھے
آئے ہیں جو زندانوں سے

آپ کو فرصت ہو تو پوچھیں
دل کا حال پریشانوں سے

غم خواری کی ، دلداری کی
کیا امید جہانبانوں سے

آج کی شب میرے گھر ٹھہریں
کوئی کہے یہ مہمانوں سے

روحی کنجاہی

دنیا سے کس لئے نہ رہوں میں الگ تھلگ
ملتی نہیں ہے اس سے میری کوئی بھی تو رگ

ٹھہرا ہے یہ معاملہ دو انتہاؤں کا
اک سمت میں ہوں اور ہے اک سمت سارا جگ

کیسی گزر رہی ہے کہوں اس سے بڑھ کے کیا
میں ایک سادہ لوح ہوں اور سارا شہر ٹھگ

میں اجنبی ہوں اور نہ کوئی گداگر
بھونکے ہے دیکھتے ہی مجھے ایک ایک سگ

جانے بھڑک اٹھی ہے مرے تن میں کیسی آگ
دریا بھی ہو گیا مجھے پانی کا ایک جگ

خوشیوں کے لعل ہاتھ مرے آئیں بھی تو کیا
رکھتا ہوں میں عزیز ہمیشہ غموں کے نگ

سن کر یہ مشورہ کہ بہر حال خوش رہوں
روحی پھڑک اٹھی ہے میری ایک ایک رگ

دیکھتے دیکھتے وہ آنکھ بدل جاتی ہے
اور پھر بات بہت دور نکل جاتی ہے

سامنے آتا ہے جب بھی کوئی اچھا چہرہ
آرزو کوئی بہر حال مچل جاتی ہے

آپ ہو جاتا ہے ہیجان سا پیدا دل میں
اور پھر خود ہی طبیعت بھی سنبھل جاتی ہے

کیا ہوا آگئی ہم میں جو کوئی تبدیلی
وقت کے ساتھ ہر اک چیز بدل جاتی ہے

کیسا بھی دن ہو گزر جاتا ہے جیسے تیسے
کیسی بھی رات ہو ہر حال میں ڈھل جاتی ہے

ہو گئے راکھ دل و جاں تو تعجب کیسا
آگ کی زد پہ کوئی شے بھی ہو جل جاتی ہے

اسے مہکانے کو بردوش ہوا، اے روحی
گل کی خوشبو کی طرح میری غزل جاتی ہے

ریاض الرحمن ساغر

دروازے کی جانب دیکھتا رہتا ہوں
ہر آہٹ پر چونک سا اٹھتا ہوں

وہ کہیں گہری میٹھی نیند میں سوتا ہے
جس کے ہجر میں شب بھر میں تو جاگتا ہوں

مجھ کو سہارا دیتی ہے امید کوئی
جب میں چلتے چلتے گرنے لگتا ہوں

دیواروں میں در سے کھلنے لگتے ہیں
تیرے شہر سے میں جب بھی گزرتا ہوں

سننے والے کہتے ہیں دیوانہ ہے
جب میں ان سے ہوش کی باتیں کرتا ہوں

رفیق سندیلوی

واپس نہ آئے پھول سے جسموں کو چیر کے
جھوٹے تھے کتنے ربط کمانوں سے تیر کے

کھڑکی میں طشت تھامے ہوئے تھا کسی کا ہاتھ
ٹوٹے پڑے تھے کاسے گلی میں فقیر کے

کٹ جائے خیر ہی سے نیابت کا مرحلہ
شہزادگاں سے جلتے ہیں بیٹے وزیر کے

سوچو تو بے جواز تھیں کھیڑوں سے نفرتیں
کیدو نے سارے خواب بکھیرے تھے ہیر کے

کاغذ پہ ثبت کوئی تو ایسا پیام تھا
دشمن نے پاؤں کاٹ دیئے ہیں سفیر کے

ساحل احمد

ان کہا کوئی فسانہ تو نہیں
یہ اسیری کا زمانہ تو نہیں

فصل گل تو فیصلہ کروے مرا
رنگ میرا مجرمانہ تو نہیں

روکتا ہے کیوں قدم کوئی مرے
دوستوں کا میں نشانہ تو نہیں

قتل کا فرمان جاری ہو گیا
نیچے قدموں کے خزانہ تو نہیں

جگنوؤں کی کیا قطاریں سج گئیں
آگ تیرا کارخانہ تو نہیں

برق چمکی گلستاں میں بار بار
آسماں کا تازیانہ تو نہیں

فصل گل اب تو دعائے خیر کر
کل سے اچھا یہ زمانہ تو نہیں

سجاد مرزا

بچھڑنے سے مری آنکھوں میں طغیانی نہیں آئی
مرے اندر کے موسم میں بھی ویرانی نہیں آئی

مجھے بھی اپنے مٹنے کا کوئی صدمہ نہیں پہنچا
تعجب! اس کی آنکھوں میں بھی حیرانی نہیں آئی

نگاہیں پھیر لیں اس نے تو سمجھا ہے یہی ہم نے
کہ ہم کو اپنے دل کی بات سمجھانی نہیں آئی

اسی باعث گزاری زندگی گوشہ نشینی میں
ردائے حاجت دل ہم کو پھیلانی نہیں آئی

ملی ہے سرفرازی تو یہی محسوس ہوتا ہے
مری منزل میں کوئی راہ انجانی نہیں آئی

یہ کیسے اجنبی لوگوں نے گھیرا ہے مکانوں کو
مری بستی میں اک صورت بھی پہچانی نہیں آئی

ترا بھی گرچہ ارباب حکومت سے تعلق تھا
مگر سجاد تجھ سے بوئے سلطانی نہیں آئی

سراج المنیر تسنیم

جذبہ شوق کارگر ہو گا
یوں تڑپنا نہ بے اثر ہو گا

کون پھر اس کو دیکھ سکتا ہے
پیکر نور وہ اگر ہو گا

ڈھونڈ لوں گی میں خواب کی تعبیر
سامنے ایک دن وہ در ہو گا

لگ رہا ہے طویل تر جو سفر
رفتہ رفتہ ہی مختصر ہو گا

کوئی آہٹ ہو کوئی دستک ہو
دل یہ کہتا ہے نامہ بر ہو گا

زخم کھانے کا حوصلہ کر لو
ہر قدم پھر تو معتبر ہو گا

چاند ہر دم سفر میں رہتا ہے
ڈھونڈتا ہے کہیں تو گھر ہو گا

اس کو دنیا کی آگہی نہ سمجھ
کوئی مجھ سا ہی بے ہنر ہو گا

پھول الفت کے جس جگہ مہکے
وہیں تسنیم اپنا گھر ہو گا

ستار سید

دل عرصہ اشتباہ میں ہے،
اک خواب وفا نگاہ میں ہے،

گزرا ہے کوئی ابھی یہاں سے،
اڑتی ہوئی گرد راہ میں ہے،

سو وسوسے کر رہا ہے پیدا!!
یہ کج جو تری کلاہ میں ہے،

منزل ہے چراغ اور دریچہ
بارش کی فصیل راہ میں ہے

سالار ملے ہیں دشمنوں سے
افسردہ دلی سپاہ میں ہے

برباد ہیں باغ اور رونق
ہر شہر کی قتل گاہ میں ہے

صد حیف بسیرا فاختہ کا
بازوں کی پناہ گاہ میں ہے

دل، اے دکھوں سکھوں کے خالق!
حاضر تری بار گاہ میں ہے

سعود عثمانی

چاند آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جاتا ہے
شب کا منظر مجھے بے خواب سا کر جاتا ہے

جب بھی یادوں کی مہک آتی ہے میں سوچتا ہوں
وقت پھولوں کی طرح کھل کے بکھر جاتا ہے

کشتِ ویراں ، کبھی سیراب نہیں ہو پاتی !
جی امنڈتا ہے تو پل بھر میں ٹھہر جاتا ہے

نقش بنتے بھی نہیں ہیں کہ بگڑ جاتے ہیں
خواب آنے نہیں پاتا کہ گزر جاتا ہے

تجھ سے مل کر بھی ہیں دیدار کی پیاسی آنکھیں
جیسے دریا کسی صحرا میں اتر جاتا ہے

ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں منظر روشن
جب بھی وہ شخص تصور سے گزر جاتا ہے

رات جتنی بھی سیاہی کو لئے آئے سعود
صبح کا رنگ ذرا اور نکھر جاتا ہے

سلیم کوثر

وسعت ہے وہی تنگئ افلاک وہی ہے
جو خاک پہ ظاہر ہے پس خاک وہی ہے

اک عمر ہوئی موسم زنداں نہیں بدلا
روزن ہے وہی مطلع نم ناک وہی ہے

کیا چشم رفوگر سے شکایت ہو کہ اب تک
وحشت ہے وہی سینہ صد چاک وہی ہے

ہر چند کہ حالات موافق نہیں پھر بھی
دل تیری طرف داری میں سفاک وہی ہے

اک ہاتھ کی جنبش میں در و بست ہے ورنہ
گردش وہی ، کوزہ ہے وہی ، چاک وہی ہے

جو کچھ ہے مرے پاس، وہ میرا نہیں شاید
جو میں نے گنوادی مری املاک وہی ہے

زوروں پہ سلیم اب کے ہے نفرت کا بہاؤ
جو بچ کے نکل آئے گا تیراک وہی ہے

سید صفدر رضا کھنڈوی

بعد مدت حصار سے نکلا
چپ کے تاریک غار سے نکلا

لیکے سورج عجیب تابانی
ظلمتوں کے غبار سے نکلا

یہ نتیجہ کہ ہم ہیں گردش میں
ذکر لیل و نہار سے نکلا

تھا پریشان کرب پیہم سے
ذات کے انتشار سے نکلا

ناز کر ناز اے دل وحشی
سرخرو کوئے یار سے نکلا

اے رضا چبھ رہا تھا جو دل میں
خار وہ نوک خار سے نکلا

سلمان سعید

نگر میں ایک عجب شخص ایسا رہتا ہے
جو خامشی سے ہر اک درد ہنس کے سہتا ہے

مجھے تو راہ میں تنہا نہ چھوڑ جائے کہیں
ہر ایک پل یہ مجھے وسوسہ سا رہتا ہے

اسے بلاتی ہے ہر لمحہ دل کی ہر دھڑکن
بچھڑ کے بھی جو میرے آس پاس رہتا ہے

مجھے تلاش کرو گے تو مل ہی جاؤں گا
کوئی خیالوں میں آکر یہ مجھ سے کہتا ہے

ساغر مشہدی

یہ سوچنا ہی عبث ہے کہ گھر میں رہنا ہے
مسافروں کو ہمیشہ سفر میں رہنا ہے

وہ آفتاب ہے روشن رہے گا دنیا میں
غروب ہو کے بھی اس کو قمر میں رہنا ہے

کنار بحر مری دسترس میں ہو بھی تو کیا
بھنور نصیب ہوں مجھ کو بھنور میں رہنا ہے

طلسم ظلمت شب جب تلک نہ ٹوٹے گا
تلاش قریہ ارض سحر میں رہنا ہے

سلگتے دشت کا باسی ہوں اس لئے ساغر
تمام عمر گرفت شرر میں رہنا ہے

سلیم انصاری

شجر تو کب کا کٹ کے گر چکا ہے
پرندہ شاخ سے لپٹا ہوا ہے

سمندر ساحلوں سے پوچھتا ہے
تمہارا شہر کتنا جاگتا ہے

بہا کر لے گئیں موجیں گھروندہ
وہ بچہ کس لئے اب ہنس رہا ہے

اب اس سے دوستی کا ہاتھ مانگو
وہ اپنے جسم کے باہر کھڑا ہے

ہوا کے ہاتھ خالی ہوگئے ہیں
یہاں ہر پیڑ ننگا ہو چکا ہے

سید ضمیر جعفری

وہ خار و خس سے رنگیں تتلیوں کے پر بناتی ہیں
محل یا جھونپڑی ہو، مائیں گھر کو گھر بناتی ہیں

یہ ریشم کے ملائم تار کتنے نرم و نازک ہیں
یہ پوشاکیں مگر انسان کو پتھر بناتی ہیں

نئی دنیا میں ماضی کی مروت ڈھونڈنے والو!
نئی قدریں بشر کو صرف سوداگر بناتی ہیں

کسانوں کی ہتھیلی پر نہ جب اپنا پسینہ ہو
برس کر بھی، زمیں کو بدلیاں بنجر بناتی ہیں

ہنر گاہوں کے سانچوں کو بدل ڈالا ضرورت نے
جو خوشبوئیں بناتی تھیں، وہ اب خنجر بناتی ہیں

شکستیں عارضی پسپائیوں کا نام ہیں شائد
سڑک پر بھی بہادر چیونٹیاں لشکر بناتی ہیں

زمیں پر اپنے سالم پاؤں سے ناپ اپنی قامت کو
کہاں تک ایڑھیاں انساں کو قد آور بناتی ہیں

ترے پیکر کو چرواہوں کے خوابوں نے تراشا ہے
ہماری کھیتیاں تیرے لئے زیور بناتی ہیں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

جو ڈر کے مجھ سے میرے مقابل نہیں ہوا
وہ حلقہ رقیب میں شامل نہیں ہوا

کوشش کے باوجود جو حاصل نہیں ہوا
اس کی طرف یہ دل کبھی مائل نہیں ہوا

بڑھتا ہے روند کر جو غریبوں کی بستیاں
اس قافلے میں میں کبھی شامل نہیں ہوا

امید اس کو پانے کی زندہ ہے اب تلک
میں اپنی خواہشات کا قاتل نہیں ہوا

میں اطمینان بانٹتا پھرتا ہوں دہر میں
گو خود قرار دل مجھے حاصل نہیں ہوا

زندہ ہوں سعدی اب بھی غموں کے دیار میں
اب تک میں درد قلب کا قائل نہیں ہوا

سید آل احمد

نہ سہی پیار حقارت سے کبھی بول کے دیکھ
کوئی تو زہر مری روح میں تو گھول کے دیکھ

میری آواز کہاں تک تری دیوار بنے
شدت کرب سے تو بھی تو کبھی بول کے دیکھ

میرے اخلاص کی تصویر جلانے والے
دکھ کا منظر تو دردیدہ ودل کھول کے دیکھ

اپنی تنہائی کے اس گھور اندھیرے سے نکل
کیا ہے باہر کی فضا آنکھ ذرا کھول کے دیکھ

دیکھ کس طاق میں جلتا ہے ترا دکھ احمد
سوچتا کیا ہے در قصر غزل کھول کے دیکھ

سید عطا جالندھری

عظیم لوگ ہیں اظہار غم نہیں کرتے
کہ دل تو روئے مگر آنکھ نم نہیں کرتے

سیاہ ظلم کی کرتے نہیں پذیرائی
حضور شاہ کبھی سر کو خم نہیں کرتے

یہ اور بات ہے کہ آنکھیں بیان کرجائیں
وہ داستان غم جاں رقم نہیں کرتے

تری نظر نے یہ کیسا سکوت پھیلایا
غزال دشت تمنا کے رم نہیں کرتے

ہمارے دل پہ گزرتی ہے جو شب ہجراں
بیان اس کا ستاروں سے ہم نہیں کرتے

وگرنہ کونسا پیالہ ہے کیسی مٹی ہے
جسے یہ اہل نظر جام جم نہیں کرتے

جہاں سے فیصلے بس مصلحت کے صادر ہوں
سر نیاز کو اس در پہ خم نہیں کرتے

جو دن کی روشنی پر آجکل مسلط ہیں
وہی تو ظلمت شب کو بھی کم نہیں کرتے

عطا وہ کس قدر آداب سے ہیں بے بہرہ
جو لوگ حرمت اہل قلم نہیں کرتے

خودی کو بیچ کر مال و زر دنیا ملا تو کیا؟
زمیں سے ٹوٹ کر رشتہ فلک سے جڑ گیا تو کیا؟

مزا جب تھا تمہاری مفلسی کو بھی وہ اپناتے
حقیقت کو نہاں رکھ کر انہیں اپنا لیا تو کیا؟

ستم کے دور میں جس نے کٹایا سر امر وہ ہے
کسی کے سر کو تونے دوش پر جو رکھ لیا تو کیا؟

تمنا تھی کہ ہو جاتی وفاؤں کی پذیرائی
ہمارے بعد جو تونے ہمیں چاہا کیا تو کیا ؟

اگرچہ لو ہو مدہم پر چراغ اپنا ہی اچھا ہے
کسی کے خون سے اپنا دیا روشن کیا تو کیا؟

یہ کیسے لوگ ہیں سب دیکھ کر خاموش رہتے ہیں؟
جو ان کے روبرو وہ حادثہ بھی ہوگیا تو کیا؟

پس زنداں ہی گزرے زندگی کے سب حسیں لمحے
ہمیں مژدہ رہائی کا جو اس نے اب دیا تو کیا؟

وطن کی آگ تو ان آنسوؤں سے بجھ نہیں سکتی
تو [illegible]ان عطا جی بھر کے تو نے رولیا تو کیا

سیدہ رابعہ نہاں

حسن ادا شناس ہو مشق ستم سوا کرے
آئے وہ کاش میرے پاس پر نہ ابھی خدا کرے

منزل شوق میں کہ ضبط شیوہ اہل درد ہو
حسن سے کچھ گلہ نہ ہو عشق کہ لب سیا کرے

سوزش قلب کی بھی تو کرتی ہے روشنی بہم
وہ کہ رہ حیات میں روشنیاں کیا کرے

گرنہ بشر میں ہوں صفات پھر وہ بشر بشر نہیں
ایسا نہ ہو فنا کا ذوق وصف بشر فنا کرے

مقصد زیست بھول کر تنہا ہے آج آدمی
روح کی ہر پکار کیا گوش خرد سنا کرے

کارگہہ حیات میں رونق بزم سوز عشق
کاش ہمارے دل کو بھی سوز دردوں ملا کرے

عالم رنگ و بو میں سب حسن ہو اس کا جلوہ گر
آنکھ بشر جو وا کرے رمزنہاں کھلا کرے

سید یاسین قدرت

میں ایک طائر مقتول کا ہوں پر مجھ کو
کوئی ہوا لئے پھرتی ہے در بدر مجھ کو

یہ اور بات کہ بجلی قدم قدم لہری
وگرنہ پیش تھا تاریک تر سفر مجھ کو

میں پھر بھی چھاؤں ہی دوں گا، ہوں لاکھ نذر خزاں
سمجھ کے آئیں مسافر ہرا شجر مجھ کو

کسی اجالوں کے تارے سر فلک دمکے
کوئی بھی دے نہ سکا آج تک سحر مجھ کو

کوئی تو روزن ماضی میں بیٹھ کر کب سے
صدائیں دیتا ہے، آتا نہیں نظر مجھ کو

بہا تھا جس پہ مرا خون ناروا قدرت
رکھے گی یاد ہمیشہ وہ رہ گزر مجھ کو

میں ایک اور ہی گرداب میں رہا قدرت
دکھائی دیتا رہا اور اک بھنور مجھ کو

سید نثار حسین ہمدانی

جن کی نظر ہے لعل و گہر کے فریب میں
بھٹکیں گے شاخ شاخ ثمر کے فریب میں

اس کے سوا دکھائی نہ دیتا تھا کچھ مجھے
میں آگیا تھا کس کی نظر کے فریب میں

اک رت جگے میں آنکھ کی بینائی چھن گئی
کتنی اذیتیں تھیں سحر کے فریب میں

میں اس کے دل میں جا کے زمانے سے کٹ گیا
بے گھر سا ہو گیا تھا میں گھر کے فریب میں

اک عمر ساتھ چل کے بھی منزل نہ مل سکی
صدیوں کا فاصلہ تھا سفر کے فریب میں

شاہد واسطی

زندگی کو معتبر جانا تھا پہلی مرتبہ
ایسا چہرہ سامنے آیا تھا پہلی مرتبہ

رات میں نے خواب دیکھا تھا کھلی آنکھوں کے ساتھ
روشنی نے جسم کو پہنا تھا پہلی مرتبہ

دائرے ہی دائرے تھے زندگی کی جھیل میں
ان سے مل کر دل بہت دھڑکا تھا پہلی مرتبہ

زندگانی کے حوادث فتح کر لینے کے بعد
میری باتوں میں اثر آیا تھا پہلی مرتبہ

شاہد رضا

دو دن کہیں گزارے تو دو دن کہیں رہے
اب تم بھی اعتبار کے قابل نہیں رہے

میں خود بھی چاہتا ہوں سوالوں میں گم رہوں
لیکن تری نظر کا اجالا یہیں رہے

بے آب بادلوں کو گھنا کب تلک لکھوں
کب تک کسی کے دل کی زمیں مخملیں رہے

آنکھیں کھلی رہیں ترے دیدار کے لئے
سجدوں کے واسطے یونہی بے کل جبیں رہے

ناکامیوں کے ذکر مکرر سے فائدہ
پتھر جو راستے کے تھے آخر وہیں رہے

دروازہ دل کا وا ہے مگر شرط ہے یہی
خنجر نہ ہاتھ میں نہ تہہ آستیں رہے

یوں پتھروں میں ہم نے گزاری ہے زندگی
جیسے سیاہ قلب میں نور یقیں رہے

شاہد وہ خواہشوں کے پرندے عجیب تھے
چپ چاپ مدتوں مرے دل میں مکیں رہے

شاہد اسلام دانش

جلترنگ بج اٹھی وحشتوں کے جنگل میں
حسن کی پری اتری خواہشوں کے جنگل میں

جب گرا تھا میں تھک کر بے کسی کے پنجرے میں
کھو گئی تھی اک سسکی قہقہوں کے جنگل میں

زندگی کی تصویریں کہکشاں بناتی ہے
نفرتوں کے صحرا میں چاہتوں کے جنگل میں

پھول سے حسیں چہرے مسکرا رہے ہونگے
گھر نما قفس جیسی کھڑکیوں کے جنگل میں

تتلیوں کے پنکھوں پر لکھ کے اک غزل میں نے
پھینک دی تھی کل یونہی حسرتوں کے جنگل میں

کہہ رہا تھا ننھا سا مجھ سے ایک حسیں بچہ
لے چلو نا اب مجھ کو جگنوؤں کے جنگل میں

شان الحق حقی

مہ و انجم گل و گلزار کا شاہد میں ہوں
جلوہ بسیار ہے حق یہ ہے کہ واحد میں ہوں

خود ہی انوار چلے آتے ہیں مجھ تک ورنہ
آنکھ کے تل کی طرح نقطہ جامد میں ہوں

میری جنت بھی یہیں ہے مری دوزخ بھی یہی
وہ یہ سمجھے کہ کہیں دور سے وارد میں ہوں

لطف کہئے کہ ستم ہے انہیں اس پر اصرار
بھیجیں پیغام وہ اوروں کو تو قاصد میں ہوں

روبہ دنیا ہی سہی پشت بہ کعبہ ہی سہی
شیخ کو ضد ہے سر منبر مسجد میں ہوں

داغ دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ پیش داور
تجھ کو کس بات کا ڈر ہے ترا شاہد میں ہوں

مجھ کو معلوم تو ہے سعی طلب کا انجام
پھر بھی کیوں مرتکب ترک مقاصد میں ہوں

خاک کہتی ہے کہ کیا شرف نسبت و نام
تو ہے مجھ سے ترا مسکن ترا مولد میں ہوں

وہ جو خود مائل فتنہ ہیں انہوں نے حقی
مجھ پہ الزام تراشا ہے کہ مفسد میں ہوں

شبنم رومانی

ڈھلتا سورج ' آنکھ کا ریزہ ہو جاتا ہے
جھوٹے خوابوں کا آمیزہ ہو جاتا ہے

پہلے شیشہ ٹوٹ کے خنجر بن جاتا تھا
لیکن اب تو ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے

اپنے فقروں سے ہشیار ' کہ فقرہ اکثر
دشمن کے ہاتھوں کا نیزہ ہو جاتا ہے

حسن کی سنگت پھول کی رنگت سے مس ہو کر
شبنم کا آنسو ' آویزہ ہو جاتا ہے

بے صدا مکانوں سے مجھ کو خوف آتا ہے
جب طیور لٹتے ہیں پیڑ چہچہاتا ہے

یہ فلک جو بالو ہے' وہ پڑا ہے اپنوں پر
کھاگئی ہے بچوں کو' یہ زمیں جو ماتا ہے

جیتے جی تو یہ بندھن ٹوٹ ہی نہیں سکتا
یار ا دل کی دھڑکن سے عمر بھر کا ناتا ہے

بوجھ ہیں جو دھرتی کا خوب سوچ لیں شبنم
بے سبب نہیں آتا زلزلہ جب آتا ہے

شبنم رومانی

آخر شب جو بہم صبح کے اسباب ہوئے
حملہ آور مری آنکھوں پہ مرے خواب ہوئے

تشنگی بھی تو ہے اک سیل بلا کی صورت
بستیاں غرق ہوئیں، خشک جو تالاب ہوئے

اب نہ آئیں گے کبھی قحط وفا کی زد میں
وہ علاقے مرے اشکوں سے جو سیراب ہوئے

خواب دیکھے تھے بہت 'جنت گم گشتہ کے خواب
تجھ کو دیکھا تو مجسم مرے سب خواب ہوئے

داغ رسوائی نہیں، تمغۂ اعزاز ہے یہ
تری نسبت کی قسم، ہم بھی خوش القاب ہوئے

میں نے اک روز نظر بھر کے تجھے دیکھا تھا
پھر تو اس نشے کے عادی مرے اعصاب ہوئے

یاد آیا ہے بہت شاہ جہاں پور ہمیں
بعد مدت کے جو ہم وارد پنجاب ہوئے

ہم ترے حسن میں بھی شان خدا دیکھتے ہیں
پھول سے جسم پہ شبنم کی قبا دیکھتے ہیں

زندگی یوں تو ہے اک عالم حیرت لیکن
کچھ طلسمات بڑے ہوشربا دیکھتے ہیں

جی مچلتا ہے جو گرمی کی خنک راتوں میں
چاند بن کر ہم اسے صحن میں جا دیکھتے ہیں

ایک میں ہوں کہ زمانہ نگراں ہے مری سمت
ایک وہ ہیں جو زمانے کی ہوا دیکھتے ہیں

عہد حاضر کا ادب ، سوء ادب ہے اے دوست
رنگ ہم بھی ترے چہرے کا اڑا دیکھتے ہیں

شبنم شکیل

کسی دھارے میں بھی شامل نہیں تھا
یہ میرا دل کہ اک سائل نہیں تھا

مری دشمن تھی میری بے یقینی
زمانہ راہ میں حائل نہیں تھا

اسے کھونے کا اندیشہ تھا اس میں
اسے پانا تو کچھ مشکل نہیں تھا

سفر کا حوصلہ آیا تھا دینے
وہ سنگ میل تھا منزل نہیں تھا

اسے میں مانگ سکتی تھی اسی سے
مگر دل بھیک کا قائل نہیں تھا

شہاب صفدر

مہک پھر رہی ہے جزیرے جزیرے
ہوا کے سمندر میں پتے جزیرے

نہ کشتی رہی اور نہ خوف تلاطم
لگے پرسکوں بے بسی کے جزیرے

بتا اے کرن! کھولتی وسعتوں میں
رہے غیر آباد کتنے جزیرے

سر بادباں عکس تھے جنگلوں کے
سفینے تھے یا چلتے پھرتے جزیرے

سر آب حلقہ بپا منزلیں تھیں
تہ آب تھے رقص کرتے جزیرے

عجب خواہشیں دل کے دریا میں ابھریں
دکھائی دیئے سات رنگے جزیرے

کئے اس کی آنکھوں میں دریافت ہم نے
شہاب اپنے خوابوں کے اودے جزیرے

شاہیں فصیح ربانی

حق کا رستہ رسن و دار سے آگے نہ بڑھا
سر کوئی جبہ و دستار سے آگے نہ بڑھا

ایسی تاریخ نہ لکھ اس سے کہ دل کانپ اٹھے
یہ قلم ہے اسے تلوار سے آگے نہ بڑھا

یہ نہ ہو قافلہ رستے میں بھٹک جائے کہیں
یوں قدم قافلہ سالار سے آگے نہ بڑھا

بادباں جس کے ہواؤں سے الجھ ہی نہ سکیں
وہ سفینہ کبھی منجدھار سے آگے نہ بڑھا

عکس کو چھو کے نہ دیکھا یہ کمال اس کا ہے
آئینہ حسرت دیدار سے آگے نہ بڑھا

چبھ گیا ہے مرے دل میں کسی پیکاں کی طرح
تیرا اقرار کہ انکار سے آگے نہ بڑھا

ہے تقاضا یہی آداب محبت کا فصیح
اپنی نظروں کو رخ یار سے آگے نہ بڑھا

شہرت بخاری

شام ہونے کو ہے لازم ہے کہ اب گھر کو چلیں
تم سلامت رہو ' ہم یاد رہیں یا نہ رہیں

گفتنی دل میں ہیں مضمون کئی ایک سے ایک
آئنہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے کہہ لیں

سانس لیتے ہوئے پتھر ہیں سراسر یا رب!
سننے والا ہو تو حالِ دلِ مقتول کہیں

آؤ ! گلزار کھلائیں کوئی اپنا اپنا
یعنی اس دشتِ مروت سے کہیں دور چلیں

جو ہمیں قتل کرے ہم بھی اسے قتل کریں
جو ہمیں بھول گیا ہے اسے کیوں یاد کریں

ایک سے ایک مصیبت میں گرفتار ہیں سب
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم کس سے ملیں

اب تو خلوت کا تصور بھی نہیں ہے شہرت
کاش جلوت ہی میں پل بھر کو نظر آجائیں

شہرت بخاری

دل لگایا ہے تو اب اس کا نتیجہ دیکھو
باغ کو پھونک کے پھنکتا ہوا صحرا دیکھو

کس نے برسوں کی رفاقت کا کیا منہ کالا
تذکرہ کس کا ہے یہ، کس کا ہے چرچا دیکھو

تم سمجھتے ہو کہ حالات وہی ہیں کہ جو تھے
کل جہاں قطرہ نہیں تھا وہاں دریا دیکھو

پاس جانا نہ کسی کے نہ قریب آئے کوئی
دور ہی دور سے دنیا کا تماشا دیکھو

آنکھ انگاروں سے معمور تو سینے میں الاؤ
آج کس رنگ سے ہوتا ہے سویرا دیکھو

یوں ہی ہاتھ آتا نہیں گوہر مقصد، پہلے
ماہ کنعاں کے لئے خواب زلیخا دیکھو

یاد کرنا ہمیں اور فاتحہ پڑھنا اپنی
ساری دنیا میں اگر ایک بھی ہم سا دیکھو

اتنے افسردہ ہو کیوں وقت رواں ہے شہرت
شام کی دھندی روشن ہے ستارہ دیکھو

اس قدر شام پڑے روتا ہے
دیکھ آگے ابھی کیا ہوتا ہے

ساری دنیا سے الگ ہے یہ شہر
جاگتا ہے نہ کبھی سوتا ہے

پہلے جو سوتا تھا وہ کھوتا تھا
آج جو جاگتا ہے وہ کھوتا ہے

اور بھی آتا ہے وہ نظروں میں
جتنا دامن سے لہو دھوتا ہے

یہ جو احباب میں یوں ہنستا ہے
چھپ کے تنہائی میں کیوں روتا ہے

دیکھ تو آن کے یہ شخص ہے کون
راہ میں تیری جو دل بوتا ہے

سہمی رہتی ہے فضا بستی کی
رات بھر کوئی کہیں روتا ہے

تجھ سے مل کر جو ہنسا تھا برسوں
یاد کر کر کے تجھے روتا ہے

مجھ کو رونے سے ہے نفرت شہرت
کیا کروں درد بہت ہوتا ہے

شہزاد احمد

رت بھی دیوانی تھی دل پر بھی نہ تھا قابو مجھے
ساتھ ہی اپنے اڑا کر لے گئی خوشبو مجھے

آج تک اس باغ کے تارے جنہیں سمجھا تھا میں
آج انگارے نظر آتے ہیں وہ جگنو مجھے

آخرش ذوق تجسس ہی مرے کام آئے گا
جنگلوں میں دور تک لے جائیں گے آہو مجھے

عمر کم ہوتی ہے ان بپھرے ہوئے دریاؤں کی
رات بھر میں خشک کردیں گے مرے آنسو مجھے

باغ دنیا ہو کہ جنت کچھ نہیں مجھ کو قبول
اب مجھے کیا چاہئے جب مل گیا ہے تو مجھے

پھر کھلا مجھ پر کہ غم اپنا مداوا آپ ہے
دیر سے ملتا نہ تھا اس درد کا دارو مجھے

خاک سے انساں بنایا ہے مجھے جس سحر نے
خاک میں تبدیل کردے گا وہی جادو مجھے

بن گیا ہوں آپ اپنی ذات کی پرچھائیں میں
پھونک ڈالے گا کوئی جوگی کوئی سادھو مجھے

ایسے موسم میں کہ ہیں سوکھی ہوئیں سب ندیاں
خاک کے بادل دکھاتا ہے دل بد خو مجھے

قید سے باہر تو لے آئی مری دیوانگی
اب کہاں لے جائیں گے ٹوٹے ہوئے بازو مجھے

راس آتا ہی نہیں شہزاد ہنگام بہار
دھوکا دیتے ہیں ہمیشہ ہی سے رنگ و بو مجھے

شہزاد احمد

لوٹ کر میری طرف اے مرے دلبر آجا
منتظر ہوں کبھی تصویر کے باہر آجا

میں تجھے سارے زمانے سے بچانا چاہوں
تیز ہے دھوپ مری آنکھوں کے اندر آجا

دیکھ ویران ہوئی جاتی ہے دنیا میری
میرے غم خانے میں جنت کو بھلا کر آجا

تیرے ہونے سے کھلیں گے یہاں سو رنگ کے پھول
خشک صحرا کی طرف میرے سمندر آجا

دستکیں دیتا ہے یہ دل ترے دروازے پر
اختر صبح کسی روز زمیں پر آجا

سانس لینے کی مرے شہر کو مہلت مل جائے
تو اگر ابر ہے سورج کے برابر آجا

شہناز مزمل

ده کھلی آنکھوں میں ٹھہری منظروں کی آرزو
ندھے رستے کر رہے ہیں منزلوں کی آرزو

ڑ کر مٹی مری دوبارہ کیوں گوندھا گیا
ر رہا ہے یہ جہاں کن سلسلوں کی آرزو

ر مرا ذوق تخیل بھی مجسم ہوگیا
ر ہوئی ذوق سفر کو قافلوں کی آرزو

ب عجب منظر مرے پیش نظر ہے آج کل
ار کی دہلیز ہے اور نفرتوں کی آرزو

ب زمیں و آسماں آپس میں مل سکتے نہیں
ر رہی ہے خاک پاکیوں رفعتوں کی آرزو

قہ گرداب میں شہناز اک مدت سے ہے
ژوں کی اس مکیں کو ساحلوں کی آرزو

شاہین عباس

مجھے صبح کوئے جمال دے۔ مجھے شام شہر وصال دے
یہ جو لفظ لفظ ہیں سسکیاں یہ کتاب جاں سے نکال دے

کسی گرد میں ہوں اٹا ہوا! کسی رنگ روپ میں ڈھال دے
مری گل رتوں کو بحال کر مری خوشبوؤں کو کمال دے

میں جو بے بدن ہوں پڑا ہوا! مجھے کیا سراغ ملے مرا
کوئی نقش گر مجھے شکل دے، کوئی آئینہ خدو خال دے

یہ عجیب رت ہے ملاپ کی کہ کسی بے کنار سراب سی
نہ زباں کو اذن سخن ملے۔ نہ لبوں کو حرف سوال دے

مری عمر یوں نہ رکی رہے۔ مری آنکھ یوں نہ جھکی رہے
کسی وہم ہی کا یقین دے۔ کسی خواب ہی کا خیال دے

وہ غروب لفظ کا حادثہ۔ مجھے ظلمتوں میں پرو گیا
یہ طلوع فکر کا سلسلہ۔ دل شب زدہ کو اجال دے

شفیق احمد

پس ملامت دل لس جاں کو ترسے ہیں
ستم کے شہر میں اک مہرباں کو ترسے ہیں

دعائیں میری بھٹکتی رہیں خلاؤں میں
یہ میرے سجدے سدا آستاں کو ترسے ہیں

کشش عجیب تھی اس آب و گل کی دنیا میں
فلک پہ کروبیاں خاکداں کو ترسے ہیں

ہم اپنی ذات کے زنداں میں یوں مقید تھے
تمام عمر کھلے آسماں کو ترسے ہیں

کسی سے ٹوٹ نہ پائی فصیل حبس و الم
فضائے جبر میں اذن زباں کو ترسے ہیں

تمام شہر ہراساں مثال مقتل تھا
غبار خوف میں جائے اماں کو ترسے ہیں

یہ عمر ختم ہوئی رائیگاں مسافت میں
سکون دل کو، در آشیاں کو ترسے ہیں

متاع غم بھی مرے دل سے چھن گئی ہے شفیق
خمار لذت سوز نہاں کو ترسے ہیں

شبیر احمد خان انور

سوزش رنجش پنہاں سے میں جل جاؤں گا
دل یہ کہتا ہے کہ سینے سے نکل جاؤں گا

مجھ سے کیوں رنجش بے جا ہے تجھے اے ہمدم
شام کے دم کاہوں سورج ابھی ڈھل جاؤں گا

تجھ پہ موزوں کیا گرتو نہ سنے جان غزل
پھینک کر میں ترے کوچے میں غزل جاؤں گا

مجھ سے پوچھے گا خدا گر تو میں اس کے آگے
غم کا دیوان لئے سر ہی کے بل جاؤں گا

وقت انسانوں سے کہتا ہے سدا اے انور
پھر نہ آؤں گا جو ہاتھوں سے نکل جاؤں گا

شفیق سلیمی

درد کی شدت سے تڑپا وہ قرار آیا مجھے
ٹوٹتے اس کو جو دیکھا تو خمار آیا مجھے

اس کے کاندھے پر رکھا تھا ہاتھ میں نے پیار سے
ہر طرف عالم میں جس دم وہ پکار آیا مجھے

جیتنا کیا خاک تھا اس نے مگر اس بار وہ
میں کہ اس کی آخری پونجی تھا ہار آیا مجھے

میں گیا ہوں جس جگہ بھی، اپنی وہ فطرت سمیت
پائمالی کو مری پہنچا، سنوار آیا مجھے

پار اس کو بھی لگایا میں نے ہی جس نے شفیق
پانیوں کی تہہ میں سوچا تھا، اتار آیا مجھے

شکیل قمر

نقش افلاس کے بے رنگ رہیں گے کب تک
ظلم ریشم کی قباؤں کے سہیں گے کب تک

ہم کو دستور جہاں خود ہی بدلنا ہوگا
ورنہ ظالم کو شہنشاہ کہیں گے کب تک

کیوں نہ مظلوم کو تلوار تھما دی جائے
لوگ بڑھتے ہوئے یہ ظلم سہیں گے کب تک

ان کی شہہ رگ پہ بھی نشتر کا کوئی وار کرو
حق کو سولی پہ چڑھاتے وہ رہیں گے کب تک

آؤ کچھ چارہ کریں جاں کی حفاظت کا قمر
خون انسان سے دریا یہ بہیں گے کب تک

شمس فرخ آبادی

آغاز غزل نام زلیخا سے کیا جائے
مقطعے میں تخلص کسی یوسف کا دیا جائے

کچھ فرصت لمحات نکالو مری خاطر
تھوڑا سا مرے پاس بھی آؤ کہ جیا جائے

آؤ تمہیں سر شاری مستانہ سکھا دیں
یہ نشہ فقط دیکھ کے آنکھوں سے پیا جائے

خم ہو سر تسلیم وہاں جاں کی اماں کو
ابرو کی سناں سے بھی جہاں کام لیا جائے

تھم جائے جو کچھ دیر تماشائے جنوں تو
دامن بھی سیا جائے گریباں بھی سیا جائے

پھر حشر میں دنیا کی سزائیں بھی گنانا
جب شمس تجھے عشق کا الزام دیا جائے

شوکت ہاشمی

سمندر کا کنارا دیکھنے والا نہیں تھا
مرا پہلا نظارا دیکھنے والا نہیں تھا

سلگتی آگ جیسی چاندنی پھیلی ہوئی تھی
فلک پر اک ستارا دیکھنے والا نہیں تھا

مسافر! کس لئے بجھنے لگی آواز تیری
تو کیا اب کے بخارا دیکھنے والا نہیں تھا

کوئی غیبی اشارے کے لئے جاگا تھا شب بھر
سو اب غیبی اشارہ دیکھنے والا نہیں تھا

تو پھر وہ بخت زادی کس لئے گھر سے چلی تھی
اگر حلیہ ہمارا دیکھنے والا نہیں تھا

مگر وہ پھول تو آنکھوں میں اگ آیا تھا شوکت
اگرچہ باغ سارا دیکھنے والا نہیں تھا

شوکت مہدی

جب تنگ یہ ہو جائے تو تڑپائے زمیں بھی
اور پیاس میں جذبات کو گرمائے زمیں بھی

بویا تھا جو کل ہم نے اٹھانا تھا وہی کچھ
خود اپنے تئیں بانجھ نہ کہلائے زمیں بھی

سرسوں کی طرح ہے یہ کبھی شور زدہ ہے
بہروپ کئی طرح کے بدلائے زمیں بھی

مشکل ہے فضا ایک سی رہ جائے ہمیشہ
ہر چند کبھی خوف سے گہنائے زمیں بھی

سایہ بھی مصیبت میں سمٹ جاتا ہے مہدی
گردوں کی طرح رنگ بدل جائے زمیں کا

شیخ محمد اقبال

یہ دور تو آنسو بھی نکلنے نہیں دیتا
سنبھلے بھی تو یہ دل کو سنبھلنے نہیں دیتا

یہ خوف کہ کھو جاؤں نہ تاریکی میں شب کی
مہتاب تری یاد کا ڈھلنے نہیں دیتا

ہاتھوں کی لکیروں کی تو اک بات ہے یارو
میں خود ہی مقدر کو بدلنے نہیں دیتا

اس طور خفا مجھ سے مرا چاند نگر ہے
آنگن میں مرے دیپ بھی جلنے نہیں دیتا

ایسا نہ ہو میں دور نکل جاؤں بدن سے
احساس یہ دو گام بھی چلنے نہیں دیتا

شمس الاسلام نسیم

کم تمہارا ستم ذرا نہ ہوا
ہم کو تم سے مگر گلہ نہ ہوا

فصل گل کا اثر ذرا نہ ہوا
میرا گلشن ہرا بھرا نہ ہوا

اپنی منزل اسے کبھی نہ ملی
عزم دل جس کا رہنما نہ ہوا

ہم ترستے رہے منانے کو
کوئی ہم سے مگر خفا نہ ہوا

ہر کسی کی حدیں مقرر ہیں
کوئی بھی ناخدا، خدا نہ ہوا

دل کے بدلے جو زندگی دے دے
ایسا کوئی مرے سوا نہ ہوا

حاصل سجدہ ہم جسے سمجھیں
ایسا سجدہ کبھی ادا نہ ہوا

بادشاہوں نے بھی قدم چومے
تیرے در کا گدا، گدا نہ ہوا

نسبت خاص دونوں میں ہے نسیم
درد دل سے کبھی جدا نہ ہوا

شیراز راج

مسافروں کی جان کے عذاب ختم ہو گئے
جمال دشت مر گیا، سراب ختم ہو گئے

سحر ہوئی تو جسم و جاں میں تیرگی بکھر گئی
منڈیر پر دلوں کے پیچ و تاب ختم ہو گئے

پلٹ رہا ہوں صفحہ صفحہ آج بھی کتاب دل
مگر تمہاری آرزو کے باب ختم ہو گئے

تمہارے بعد نیند تھی، نہ رتجگے، نہ بے حسی
تمہارے بعد ہجر کے عذاب ختم ہو گئے

برہنہ پا سفر میں تھے جو قافلے نہیں رہے
جو راستوں پہ نقش تھے گلاب ختم ہو گئے

تیری طلب کا ایک پل جو دل میں آ کے رک گیا
تو روز و ماہ و سال کے حساب ختم ہو گئے

صبا اکبر آبادی

کون آیا یوں یکایک سامنے
مار ڈالا جلوہ بے نام نے

پھر اسی جانب روانہ کر دیا
چٹکیاں لے کر دل ناکام نے

چونک کر دیکھا تو اپنے دل پہ تھے
ہاتھ اٹھے تھے ان کا دامن تھامنے

کیسی آسانی سے بدلا ، کیا کہوں
خط قسمت میرے خط جام نے

حسب وعدہ میرے پاس آئے تھے تم
صبح کو شرما دیا تھا شام نے

مجھ سے ان کو بے وفائی کا گلہ
کیا خوشی بخشی ہے اس الزام نے

تیری فکر خاص کیا کہنا صبا
پاؤں چومے ہیں قبول عام نے

دل کو ضیائے غم سے منور بنائیے
ذرے کو آفتاب کا ہم سر بنائیے

میں مشق اعتبار کا نقش غلط سہی
اکثر بگاڑیے مجھے اکثر بنائیے

اک دن وفائے دوست بھی آئے گی سامنے
دل کو جفائے دوست کا خوگر بنائیے

کیا فائدہ دھڑکتے ہوئے دل جو رک گئے
جس دل کو ہو سکوں اسے مضطر بنائیے

یہ کیا کہ رخ شراب کا اک سمت ہوگیا
کوئی نظام گردش ساغر بنائیے

کہتا ہے انقلاب کہ غم کی حدیں کہاں
غربت یہ چاہتی ہے کہیں گھر بنائیے

سمجھیں گے کیا صبا دل نازک کو سنگ دل
کیوں اپنے دل کو آئینہ پیکر بنائیے

ضمیر اظہر

وقت کی لہر پہ بہنا جو بشر جانتا ہے
در حقیقت وہی جینے کا ہنر جانتا ہے

سودا جب باغ ہ کرلیتا ہے تاجر کوئی
اپنے انجام کی ہر ہیز خبر جانتا ہے

محفل غم میں نظر آتا ہے پتھرایا ہوا
خشک آنکھوں سے جو رونے کا ہنر جانتا ہے

میں نے دیکھا ہے اسے ریت سے ذرے چنتے
بچہ نادار کا ذروں کو گہر جانتا ہے

کتنا سفاک ہو طوفان پرانا مانجھی
کشتیاں پار لگانے کا ہنر جانتا ہے

خیر کا سچا مبلغ ہے وہی جو اظہر
بارش سنگ کو خدمت کا ثمر جانتا ہے

مناسب کب اسے اوروں کا مہماں ہونا لگتا ہے
جسے آرام وہ اپنے ہی گھر کا کونا لگتا ہے

نہ کر پاؤں ضرورت جب کسی محتاج کی پوری
عبث اپنا جہان خیر و شر میں ہونا لگتا ہے

بہت ہی تھک گیا ہوں زندگانی کی مسافت سے
سکوں آور تبھی تو روز و شب کا سونا لگتا ہے

کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو دانشور و شاعر
بہت نازاں ہو اپنے آپ پر تو بونا لگتا ہے

عجب سنجیدہ عادت ہوگئی ہے ان دنوں اظہر
نہ اچھا ہنسنا مجھکو اور نہ اچھا رونا لگتا ہے

ضیاء علیگ

ہر لمحہ زندہ رہ کے بھی مرتا ہے آدمی
کن کن مسافتوں سے گزرتا ہے آدمی

یوں دیکھئے تو صورت برگ خزاں ہے زرد
جب تیرا غم ملے تو نکھرتا ہے آدمی

اتنے دیئے ہیں زخم ہوائے بہار نے
چٹکے اگر کلی بھی تو ڈرتا ہے آدمی

بڑھ کر سمیٹتی ہے محبت کی رت اسے
جب ذات کے سفر میں بکھرتا ہے آدمی

زلفوں کی چھاؤں، عارض لالہ رخاں کی دھوپ
دونوں کے درمیاں ہی ٹھہرتا ہے آدمی

ڈھاتا ہے اپنے ہاتھوں سے امید کے محل
تسخیر زندگی کی بھی کرتا ہے آدمی

قد ناپنے کو فکر کی قامت کا اے ضیاء
کتنے سمندروں میں اترتا ہے آدمی

سماں بہار کا اور تازگی کنول کی سی
تری نظر میں ادائیں ہیں سب غزل کی سی

یہ سوچتے تھے کہ جی بھر کے ہم انھیں دیکھیں
ہمیں ملی بھی جو فرصت تو ایک پل کی سی

گناہ ناز اٹھی اٹھ کے اسطرح ٹھہری
شعاع جیسے پڑے آئینے پہ ہلکی سی

خدا گواہ کہ بوجھل ہیں فکر کے رشتے
اگر سخن میں لطافت نہیں غزل کی سی

مری سزا کو زمانے گزر گئے ہیں ضیاء
اگرچہ جرم محبت ہے بات کل کی سی

ضیاء بھٹی

اب تو اک خواب نظر آتے ہیں سارے موسم
درد کی دھول میں لپٹے ہیں ہمارے موسم

راہ تکتی تھیں کبھی جن کی ہماری آنکھیں !
کیا ہوئے تم ہی کہو آج وہ پیارے موسم

یہ مناظر بھی مری آنکھ نے اکثر دیکھے !
ہار کر جیت گئے ' جیت کے ہارے موسم

میں ہر اک حال میں مشکور رہا ہوں تیرا
جس طرح سے بھی گزر پائے گزارے موسم

میں کسی درد کے موسم میں ضیاء زندہ ہوں
میری دنیا سے بہت دور ہیں پیارے موسم

ضرر وصفی

باغباں کو باغبانی کا ہنر آتا نہ تھا
پیڑ تو سرسبز تھے لیکن ثمر آتا نہ تھا

ریت پر بکھرے ہوئے تھے سینکڑوں خالی صدف
دست غوطہ خور میں کوئی گہر آتا نہ تھا

راہ میں اک پیڑ کی مانند میں تنہا رہا
جانے والا لوٹ کر کوئی ادھر آتا نہ تھا

کتنے دل کش تھے بلاوے ان نگاہوں کے ضرر
راہ سے بھٹکا ہوا پھر راہ پر آتا نہ تھا

ظفر اقبال

سفر کی اک نئی تشکیل کرنا چاہتا ہوں
میں اپنا راستہ تبدیل کرنا چاہتا ہوں

کبھی چھوڑا تھا جس کو اپنی مرضی سے ادھورا
میں اب اس کام کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں

حقیقت سے یہاں انکار تو مقصد نہیں ہے
نئی اس کی اگر تاویل کرنا چاہتا ہوں

محبت ماجرا ہی کوئی ایسا تھا کہ جس کو
بیاں تفصیل در تفصیل کرنا چاہتا ہوں

یہ موقعہ پھر کبھی شاید نہیں ملنے کا مجھ کو
اسی خاطر ذرا تعجیل کرنا چاہتا ہوں

بہت سی عرضیاں ہیں جو نظر انداز کر کے
کسی ارشاد کی تعمیل کرنا چاہتا ہوں

بالآخر مان ہی جاؤنگا میں شرطیں سب اس کی
ابھی تو صرف قال و قیل کرنا چاہتا ہوں

رہا ہوں کار بیکاری ہی میں سر گرم اتنا
سو کچھ دن کے لئے تعطیل کرنا چاہتا ہوں

سکھا دی ہے ظفر دل کو بہت ابلہ فریبی
اب اس کو فارغ التحصیل کرنا چاہتا ہوں

مرے سامنے صلہ سفر نہیں آرہا
میں رواں ہوں دیر سے ، اور گھر نہیں آرہا

کہیں آس پاس وہ ہے ضرور اسی بھیڑ میں
کوئی بات ہے جو ابھی نظر نہیں آرہا

مری سوچ میں کوئی لہر ہی نہیں اٹھ رہی
مری بات میں کسی طور اثر نہیں آرہا

وہ کب آئے گا مری خوابگاہ نیاز میں
جو مرے لئے سر رہ گزر نہیں آرہا

یہ سب اپنے عیب چھپائے رکھتے ہیں کس طرح
فقط ایک مجھ کو ہی یہ ہنر نہیں آرہا

کسی رعب سے کوئی بات ہو نہیں پا رہی
کسی خوف سے کوئی کام کر نہیں آرہا

کوئی موج مجھ کو اچھالتی نہیں زور سے
مرے راستے میں کوئی بھنور نہیں آرہا

وہی دھوپ ہے میرے راستوں پہ رکی ہوئی
ابھی کوئی سلسلہ شجر نہیں آرہا

یہ چہل پہل ہے تمام اسی کے لئے ظفر
اسے آنا چاہیے تھا ، مگر ، نہیں آرہا

ظفر اقبال ظفر

دشمنوں کا حصار ٹوٹا نہیں
رقص تیغ بہار ٹوٹا نہیں

قافلے تو گزر گئے کب کے
راستے کا غبار ٹوٹا نہیں

بستیاں خاک ہوگئیں پھر بھی
نفرتوں کا شرار ٹوٹا نہیں

حادثے راہ میں بہت آئے
عزم تھا پائیدار ٹوٹا نہیں

فصل ہی فصل ہے سروں کی ظفر
ایک پل کو شمار ٹوٹا نہیں

ظفر امام

وہ اپنا درد مرے نام کرنے والا ہے
اندھیری رات میں جیسے کوئی اجالا ہے

میں اپنی حد سے تجاوز نہ کر سکوں گا کبھی
کہ میں ہی بھوک ہوں اور بھوک ہی نوالا ہے

کچھ انتظار کرو اور بارشوں کے لئے
خبر ملی ہے کہ موسم بدلنے والا ہے

مرے نصیب دعاؤں میں مجھ کو یاد رکھو
کہ تونے ہی تو مجھے مشکلوں میں ڈالا ہے

میں ایک سکہ ہوں محتاج اپنی قسمت کا
مجھے اسی نے کئی ہاتھ میں اچھالا ہے

ظفر مراد آبادی

لہجہ لہجہ بے اثر باب رسا سے منحرف
ہاتھ بھی اب تو ہوئے جیسے دعا سے منحرف

واگزاری کے لئے اے خود پسندی کیا کروں
ہیں لب اظہار حرف مدعا سے منحرف

اف یہ خاموشی کہ سناٹاہے قبرستان کا
یا سماعت ہوگئی صوت و صدا سے منحرف

ہر نفس ہے زندگی کا موت کی دستک مگر
زندگی خوش فہم ہے سیل فنا سے منحرف

تجھ سے کب تک مفلسی اس گھر کی دلداری کروں
مسئلے جس گھر کے کرتے ہوں انا سے منحرف

صورت بادل رہے ہم بھی ہواؤں کے غلام
جب بنے دریا چلے ہو کر ہوا سے منحرف

منفرد ہے اب بھی اس کی غیرتوں کا سلسلہ
ہے طلب گاروں میں طرز التجا سے منحرف

اے ظفر جب سے ہوئیں بار انا ہمدردیاں
دوست سے منکر ہوئے ہم آشنا سے منحرف

طارق جاوید

گزر گئے تھے یونہی ماہ و سال کیا کرتے
ہم اپنی تشنہ لبی کا ملال کیا کرتے

حریف آئینہ تھا زندگی کا ہر چہرا
ہم اس سے شہر میں جاں کا سوال کیا کرتے؟

تمہارے ساتھ ملاقات کی خوشی ہوتی
تمہارے بعد مگر دل کا حال کیا کرتے؟

شکاری تیز تھا پرواز سے پرندوں کی
اڑا ' اڑان سے پہلے ہی جال کیا کرتے

خود اس نے واپسی کے راستے کو ہجر لکھا
کماں سے تیر' تعلق بحال کیا کرتے؟

طارق حبیب

مگر یہ کیا کہ سبھی سے مقابلہ رکھو
کبھی تو اپنے برابر بھی آئینہ رکھو

ہم ایسے لوگ کسی ایک کے نہیں ہوتے
ہمارے ساتھ زیادہ نہ رابطہ رکھو

اب ایسا کیا کہ ہر اک بات بھول بیٹھے ہو
گزشتہ عمر سے کوئی تو سلسلہ رکھو

ہوا بہت ہے تمہیں غرور در بدری
ہمارے ساتھ کسی دن مناظرہ رکھو

تمہیں تو لگتا ہے خود پر بھی اعتماد نہیں
ہر ایک بات میں طارق مغالطہ رکھو

عابد وودود

جہاں ثمر آگیں مجھ سے وہ باغ مانگتے ہیں
یہ دوست میرے لہو کے ایاغ مانگتے ہیں

اگرچہ ساری خدائی اسی کے نام کی ہے
کراموں کے وہ مجھ سے سراغ مانگتے ہیں

میرے قبیلے کے افراد سب منافق ہیں
میں ان کو دل کی کہوں وہ دماغ مانگتے ہیں

ہماری فیض سے ان کا بھی نام چمکا ہے
ادھار ہم سے جو روشن چراغ مانگتے ہیں

بس ایک پل میں مسافر کی عمر بیت گئی
بس اب وصال مرے دل کے داغ مانگتے ہیں

عابد خورشید

دھنک کی سیج ہے رنگ سحاب اترا ہے
روش روش پہ یہ کیا انقلاب اترا ہے

کہیں پہ زرد اداسی کہیں پہ سرخ لہو
یہ کیسے رنگ ہیں جن پر گلاب اترا ہے

لبوں سے پیاس کا رشتہ سدا رہے شاکی
اسی لئے تو زمیں پر سراب اترا ہے

جنوں پہ جب بھی کہیں مصلحت کا وقت آیا
سوال آپ ہی بن کر جواب اترا ہے

دیئے ہیں واسطے سوہنی سے عشق کے اس کو
بڑی دعاؤں سے اب کے چناب اترا ہے

افق سے رات بھر آنکھوں کی جھیل میں عابد
حقیقتوں کی طرح ایک خواب اترا ہے

عابد برہانپوری

بے نشاں ہو جائیں گے بے آشیاں ہو جائیں گے
اس طرح مٹتے رہے تو داستاں ہو جائیں گے

شام غم جب آنکھ سے آنسو رواں ہو جائیں گے
میری آشفتہ سری کے ترجماں ہو جائیں گے

یہ زمانے کی روش یہ حشر کا ساماں انقلاب
منقلب اک دن زمیں و آسماں ہو جائیں گے

کیا خبر تھی ایک دن یہ وقت بھی آجائے گا
جب بہار آئے گی ہم بے آشیاں ہو جائیں گے

اہل گلشن کو ابھی تو باغباں پر ہے یقیں
چار دن کی بات ہے پھر بدگماں ہو جائیں گے

دیکھنا عابد کسی دن اہل گلشن کے لئے
آشیاں کے چار تنکے بھی گراں ہو جائیں گے

عارف پرویز نقیب

مکاں تو ایک طرف حرف لامکاں بھی نہیں
زمین پاؤں تلے سر پہ آسماں بھی نہیں

عجیب طرز جدائی ' عجیب درد فراق
بچھڑ رہا ہے وہ مجھ سے کہ بدگماں بھی نہیں

سمندروں کی تمنا نے دے دیا صحرا
کہ سر پہ کھولتا سورج ہے سائباں بھی نہیں

ہر ایک سمت تپش ہے سلگتے جسموں کی
جہاں میں آگ لگی ہے مگر دھواں بھی نہیں

اٹھا لے کوئی مجھے بھی کہ اہمیت کیا ہے
میں تیرے لب سے گرا حرف داستاں بھی نہیں

میں اس کے وار کو سمجھا تھا امتحاں اے نقیب
وہ قتل کرنے کو آیا مجھے گماں بھی نہیں

ظہیر مشرقی

جلوہ ء جاناں کی تابش کم نہیں ہو گی کبھی
زیست کی راہوں میں شام غم نہیں ہو گی کبھی

زخم دل تو اک نگاہ مہرباں کی دین ہے
زخم دل کو حاجت مرہم نہیں ہو گی کبھی

دیکھ لیں گے دل کے آئینے میں خدوخال دہر
اہل دل کو فکر جام جم نہیں ہو گی کبھی

آج رو لینے دے اپنے سامنے دل کھول کر
چشم ناداں میری پھر پرنم نہیں ہو گی کبھی

کوندتی ہے ابر مایوسی میں بھی برق امید
زندگی میں جو کشش ہے کم نہیں ہو گی کبھی

رونق بازار ہستی ہے اسی کے فیض سے
شمع دل کی روشنی مدہم نہیں ہو گی کبھی

اور لوگ آجائیں گے جب ہم نہیں ہونگے یہاں
محفل پیر مغاں برہم نہیں ہو گی کبھی

اپنی پلکوں پر سجالو ان نظاروں کو ظہیر
یہ جو ہے رنگینی موسم نہیں ہو گی کبھی

عائشہ عباسی

راستہ اچھا لگے اس کی گلی اچھی لگے
اس کے ہونے سے مجھے یہ زندگی اچھی لگے

کوئی ایسا ہو جو میری ذات آکر چھین لے
اس طرح ممکن ہے اپنی بے خودی اچھی لگے

میں اجالوں کے تعاقب میں کبھی چلتی نہیں
ان کی آنکھوں سے ملے تو روشنی اچھی لگے

سینکڑوں الفاظ میری دسترس میں ہیں مگر
ان کے ہونٹوں سے مجھے ہر ان کہی اچھی لگے

دوستوں سے بھی زیادہ تجھ سے نسبت ہے مجھے
دشمن جاں مجھ کو تیری سادگی اچھی لگے

خواہشیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں عائشہ
کاش ایسا ہو کسی شے کی کمی اچھی لگے

عاصی کاشمیری

تیرہ و تار اندھی گھپاؤں میں قید ہیں
سب لوگ اپنی اپنی اناؤں میں قید ہیں

نکلے جو لفظ منہ سے خلاؤں میں قید ہیں
پیغام جانے کتنے ہواؤں میں قید ہیں

آوارگی کا شکوہ وہ کرنے لگے مگر
چکر ابھی کئی میرے پاؤں میں قید ہیں

سڑکیں کشادہ بن گئی ہیں شہر کی طرف
مزدور لوگ اپنے ہی گاؤں میں قید ہیں

تھوڑی سی بجلیوں میں چمک اور چاہیے
طوفان بے شمار گھٹاؤں میں قید ہیں

عاصی کئے قبیلے نے جتنے بھی فیصلے
پیپل کے بوڑھے پیڑ کی چھاؤں میں قید ہیں

عبدالحکیم وفا

جبکہ ہر شخص یہاں اپنا بھلا چاہے ہے
دست قاتل بھی تو پھر رنگ حنا چاہے ہے

میں مقدر کے لکھے کو بھی مٹانا چاہوں
اور وہ میرے مقدر کا لکھا چاہے ہے

دربدر آبلہ پا خوب پھراتا ہے مجھے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چاہے ہے

دوست بن کر جو کبھی ساتھ رہا ہے میرے
مجھ سے نفرت ہے اسے پھر بھی دعا چاہے ہے

بند وہ سارے دریچوں کو کئے بیٹھا ہے
اور مرے دل کے دریچے کو کھلا چاہے ہے

قید میں رہنا گوارہ نہیں کرتا کوئی
ہر پرندہ یہاں آزاد فضا چاہے ہے

دوسروں کی کسی تکلیف کا احساس نہیں
ہر کوئی اپنے ہی زخموں کی دوا چاہے ہے

رات دن وقت کے صحرا میں سفر کرتا ہوں
میری وحشت بھی مجھے آبلہ پا چاہے ہے

اس کی اس بات پہ حیراں ہیں زمانے والے
خود جفا جو ہے مگر سب سے وفا چاہے ہے

عادل فریدی

شہر کی حالت نہ بدلی موسموں کے ساتھ ساتھ
حبس بڑھتا ہی گیا مایوسیوں کے ساتھ ساتھ

ہجرتیں جن کا مقدر ہیں وہ مرغان چمن
جھیلتے ہیں دکھ بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ

جس سے لکھی داستان خونچکاں شہہ کے حضور
وہ قلم رکھا گیا تھا انگلیوں کے ساتھ ساتھ

جرم گرچہ اس قدر سنگیں نہ تھا پر خوف سے
اس نے سرتن سے اتارے پگڑیوں کے ساتھ ساتھ

جستجو منزل کی خود کرتی ہے پیدا راستے
راہرو چلتے نہیں اب رہبروں کے ساتھ ساتھ

یہ کھنڈر اس بات کے شاہد ہیں طوفانوں سے قبل
دور تک کچھ بستیاں تھیں ساحلوں کے ساتھ ساتھ

حال و مستقبل سے بے پروا چمن زاروں کے بیچ
دوڑتے پھرتے ہیں بچے تتلیوں کے ساتھ ساتھ

ہر سہارا عارضی ثابت ہوا عادل فرید
آندھیاں شامل ہوئیں جب بارشوں کے ساتھ ساتھ

عزیز کامل

آنکھوں میں خد و خال ہیں خوابوں کی طرح کے
بھولے نہیں وہ چہرے کتابوں کی طرح کے

کچھ میرے رگ و پے کو مہکنے کا ہے لپکا
کچھ تونے دیئے زخم گلابوں کی طرح کے

کچھ میری طبیعت بھی تھی کھنڈرات سے مانوس
کچھ مجھ کو ملے شہر خرابوں کی طرح کے

اوروں پہ ترے لطف ، مصائب کا مداوئی
یاروں پہ کرم بھی ہیں عذابوں کی طرح کے

سانسوں میں بسے اور ہوئے آنکھ سے اوجھل
ہمدم بھی ملے مجھ کو حبابوں کی طرح کے

ادراک کے افلاک سے اکثر دل و جاں پر
اترے ہیں مضامین نصابوں کی طرح کے

کامل نہ زمیندار، نہ تاجر ہے ، نہ افسر
کامل کے مگر ٹھاٹھ نوابوں کی طرح کے

عزیز اعجاز

جو پل وصال تھا اسے زنجیر کرلیا
دل میں تمہارے چہرے کو تصویر کرلیا

ہم یوں تو رات سوئے تھے کانٹوں کی سیج پر
ہر خواب کو گلاب سے تعبیر کرلیا

خون جگر سے ہم نے سر شام ہجر یار
دل میں جو درد تھا اسے تحریر کرلیا

ہم نے تمہارے دھیان کی لو سے شب سفر
تاریک رہگزار کو تنویر کرلیا

دیوانگی میں جب ہوئے زنجیر آشنا
خود کو اسیر زلف گرہ گیر کرلیا

ایک ایک اینٹ جوڑ کے ایام زیست کی
گھر اس مہک کے نام پہ تعمیر کرلیا

اعجاز ایک تم نہیں اس پر فریفتہ
وہ تو جسے ملا اسے تسخیر کرلیا

عشرت مظفر

جب بھی جی چاہے میں لکھتا ہوں تشہیر تری
انگلیوں میں مری محفوظ ہے تصویر تری

میرا زندان سفر بھی تری تخلیق کا نقش
دشت بھی تیرا مرے پاؤں بھی جاگیر تری

ٹوٹتا ہی نہیں نادیدہ حصاروں کا طلسم
بجتی رہتی ہے مری خاک میں زنجیر تری

بنتی مٹتی ہے مرے نقش قدم کے نیچے
حرف مہمل کی طرح شوکت تعمیر تری

پھڑ پھڑاتی ہے کسی طائر زخمی کی طرح
میرے آئینہ تفہیم میں تحریر تری

راہ تاریک کا کیونکر سفر آساں ہوتا
دل پہ عشرت کے اترتی جو نہ تنویر تری

عرفانہ عزیز

مانوس بہت تم سے ہیں جو نام سنے ہیں
تم ہم پہ جو رکھتے ہو وہ الزام سنے ہیں

پہنچیں نہ کہیں صبح کی خوشبوئے قبا تک
قصے جو ہواؤں نے سر شام سنے ہیں

خوشبو ترے ہونٹوں کی ہواؤں میں ہے رقصاں
زلفوں نے شب وصل کے پیغام سنے ہیں

اغیار سے پیمان وفا باندھنے والے
ہم نے بھی ترے وعدے سر بام سنے ہیں

اے ارض وطن کب ہیں ترے شوق کے شایاں
ہر کوئے ملامت میں جو دشنام سنے ہیں

سلطانی جمہور کے با وصف جنوں نے
پابندی ء آداب کے احکام سنے ہیں

عمر زمان

امتحاں کی زد پہ ظرف دلربا آنے کو ہے
دل سے اب ہونٹوں پہ حرف مدعا آنے کو ہے

آنکھ سے اوجھل ہوئی ہے روشنی غائب نہیں
صبح کاذب کے تعاقب میں ضیا آنے کو ہے

لوٹ کر صحرا کی جانب سے گھٹن کے شہر میں
تازہ دم ہو کر تھکی ماندی ہوا آنے کو ہے

شہر ناوابستگی میں جھوٹ سچ کے درمیاں
حد فاصل کھینچنے کا مرحلہ آنے کو ہے

مضطرب ہو کر پرندے گھونسلوں سے اڑ گئے
قریہ بے حس میں کوئی زلزلہ آنے کو ہے

صورت حالات کی یکسانیت ہے عارضی
وقت کے چہرے پہ رنگ اک دوسرا آنے کو ہے

عہد رفتہ کے سنہرے خواب زندہ ہوگئے
پھر تمنا کے شکنجے میں انا آنے کو ہے

مشتری در قوس منزل کا اشارہ ہے عمر
پھر کوئی صحرائے امکاں زیرپا آنے کو ہے

عشرت رومانی

بہ قدر شوق کوئی شہر دل بسایا ہے
ملا ہی کیا ہے بنایا تو کیا بنایا. ہے

دھواں دھواں سا ہے سورج کی زرد کرنوں سے
زمین تپتی ہے چہروں پہ ابر چھایا ہے

گئے دنوں کی صدا شہر میں بھٹکتی ہے
یہی وہ لمحہ جاں ہے جسے گنوایا ہے

گلاب شام لئے موسموں کی چاہت میں
ہوا نے رنگ بکھیرے ہیں کوئی آیا ہے

بسا رہے ہو نئی بستیاں ستاروں پر
مگر وہ اشک جو آنکھوں میں آج آیا ہے

یہ خامشی یہ ستارے یہ کھڑکیاں یہ شب
بہت قریب کسی آرزو کا سایہ ہے

بساط دل پہ کئی دیپ بجھ گئے عشرت
بس ایک قطرہ خوں ہے جو جگمگایا ہے

حدود وقت نے سورج تراش کر عشرت
در افق پہ کسی صبح کو بلایا ہے

عظیم حیدر سید

جذبوں کے عکس منظر امکاں میں رہ گئے
بکھرے ہوئے گلاب شبستاں میں رہ گئے

جن کی ہی نہیں ہیں ابھی ماتی دھنیں
ایسے بھی نغمے ساز رگ جاں میں رو گئے

آزادیاں نصیب ہوئیں یہ الگ بات
جو حوصلے تھے مقتل و زنداں میں رہ گئے

ان سے رفو ہوا ہے زمانے کا پیراہن
وہ تار جو ہمارے گریباں میں رہ گئے

حیدر نہ ہم سے چھوٹ سکا شہر آرزو
اس کی نہیں میں اور کبھی ہاں میں رہ گئے

عرفان صادق

مری آنکھوں کے روشن سلسلوں میں قید رہتے ہیں
تمہارے عکس گہرے پانیوں میں قید رہتے ہیں

شکستہ منظروں کے خوف سے سہمے ہوئے بچے
دھنک رنگوں سے ناواقف گھروں میں قید رہتے ہیں

مری مصروفیت کے غار سے بھاگے ہوئے لمحے
تری یادوں کی ٹھنڈی بستیو ں میں قید رہتے ہیں

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم احساس سے عاری
انا کے بے کراں حیرت کدوں میں قید رہتے ہیں

کسی کی چاہتیں جب سے میسر آگئیں عرفاں!
عجب پر کیف سی بے چینیوں میں قید رہتے ہیں

علی رضا

یہ خوشی تو باعث یاس ہے ذرا سوچ لے
ترا حال کیا تجھے راس ہے ذرا سوچ لے

تجھے مبتلا نہ اداسیوں میں کرے کہیں
مری داستان میں یاس ہے ذرا سوچ لے

مرے ساتھ چلنے سے پیشتر تجھے علم ہو
یہی بے کسی مرے پاس ہے ذرا سوچ لے

بڑا فرق ہے تری ذات موج نشاط ہے
مرا لمحہ لمحہ اداس ہے ذرا سوچ لے

وہاں رسم دار و صلیب ہے تجھے کیا پتہ
وہ فضائے خوف و ہراس ہے ذرا سوچ لے

یہ جدائیوں کی رتوں کا جتنا ہے سلسلہ
یہ تری رضا کی اساس ہے ذرا سوچ لے

دل بے خبر تو بھی چل دیا ہے اسی طرف
وہ مقام ہوش و حواس ہے ذرا سوچ لے

ترے ہاتھ میں ہے زمام وقت یہ ٹھیک ہے
وہ بھی مخلص طبع شناس ہے ذرا سوچ لے

مری زندگی اسی پیرہن میں گزر گئی
یہی رنج میرا لباس ہے ذرا سوچ لے

تری دھن میں ہوں کسی موڑ پر تو ملے گا تو
مرے دل کو اک یہی آس ہے ذرا سوچ لے

کبھی تلخیوں کو بھلا کے پیار سے یقین کر
مرا حرف حرف سپاس ہے ذرا سوچ لے

عمران سلیم

دل کی بربادی کا امکان بڑی دیر سے تھا
ہم کو اندیشہ طوفان بڑی دیر سے تھا

ہم نے یکمشت ادا آج کیا ہے تجھ کو
زندگی تیرا جو تاوان بڑی دیر سے تھا

توڑ کر نوک قلم اس کو رہائی دی ہے
قید میں غم کی جو ارمان بڑی دیر سے تھا

ہو گیا مائل نفرت وہ اچانک کیسے
جو محبت کا ثنا خوان بڑی دیر سے تھا

تیری یادوں نے تو بیکار برائی لے لی
دل تو ویسے بھی پریشان بڑی دیر سے تھا

میری کوتاہی کے باعث وہ ملا دیر کے بعد
میری قسمت میں جو عرفان بڑی دیر سے تھا

آج برسی ہیں گھٹائیں وہ سمندر پہ سلیم
جن کی امید میں دہقان بڑی دیر سے تھا

علی دیپک قزلباش

امیدیں وابستہ ہوں ، تو کیونکر پیڑوں سے
پھل کے بدلے گرتے ہیں اب پتھر پیڑوں سے

خانہ ویرانی کے خوف سے کانپتے ہیں گھر میں
کونپل کونپل ، پتہ پتہ چھن کر پیڑوں سے

پلتی امیدوں کے بھی پتہ دشمن ہوتے ہیں
تازہ پتے جھڑ جاتے ہیں اکثر پیڑوں سے

بانجھ کھڑے ہیں سایہ ہے پر نہ ہی شاکر ہیں
چھین گئے سب پھل دینے کے جوہر پیڑوں سے

اک اک لمحہ ماں کی شفقت کا یاد آتا ہے
تپتے لمحے، تھکتے پاؤں ، ملکر پیڑوں سے

ہر جانب اک ہو کا عالم دیپک رہتا ہے
سارے پرندے جب جاتے ہیں اڑ کر پیڑوں سے

غافر شہزاد

زبانیں دشت کروں گا دہن اگاؤں گا
میں دشت گنگ میں شہرِ سخن اگاؤں گا

مجھے خبر ہے ترے موسموں کی سازش کی
میں اپنے تن پہ نئے پیرہن اگاؤں گا

ہوس جو مجھ کو جو اونچی اڑان میں رکھے
پروں میں اپنے میں ایسی چبھن اگاؤں گا

نہ خوش ہو مجھ کو جدا کرکے میری مٹی سے
تری زمیں پہ میں اب اپنا تن اگاؤں گا

میں اپنے کاندھوں پہ دن بھر مشقتیں بو کے
تمہارے واسطے سکھ کا چمن اگاؤں گا

جو میرے بعد بھی شاداب مجھ کو رکھے گا
میں اپنے ہاتھ پہ اک ایسا فن اگاؤں گا

غزالہ غزل

مجھ کو اس کا خیال آتا ہے
جب کوئی خوش خصال آتا ہے

ان سے لیکن میں کہہ نہیں سکتی
لب پہ پھر بھی سوال آتا ہے

یاد رکھا ہے بھول کر ان کو
مجھ کو یہ بھی کمال آتا ہے

پھول کھلتے ہیں دل کے گلشن میں
جب وہ رنگِ جمال آتا ہے

جب بھی دیکھا ہے چاند تو مجھ کو
اکثر ان کا خیال آتا ہے

میں نے سوچا ہے یہ غزل اکثر
حسن پر کب زوال آتا ہے

غلام حسین ساجد

نیند آئے گی ستاروں کو اگر افلاک پر
تو وہ چپکے سے اتر جائیں گے فرشِ خاک پر

آئینے اور اس پری کی زرد آنکھوں کے سوا
دیکھئے تو کیا نہیں ہے کوزہ گر کے چاک پر

ہے ہمیشہ کی طرح جلدی میں وہ جانِ بہار
کس قدر عجلت میں پھول آئے ہیں شاخِ تاک پر

دخل کوئی دے نہیں سکتا نظامِ دہر میں
اس لئے الزام آجاتا ہے عرشِ پاک پر

عشق میں حد سے تجاوز کر نہیں پایا کبھی
داغ ہے اک میری حسرت کا مری پوشاک پر

کر رہا ہوں اپنی قسمت کے لکھے پر اعتماد
پھر بھروسہ کر رہا ہوں میں کسی چالاک پر

جس کے کہنے پر ہوا ہوں میں اسیرِ شہرِ دل
منحصر ہے میری۔ آزادی بھی اس بے باک پر

غضنفر عباس سید

کسک نئی ہے ہماری نہ اضطراب نیا
سحر کی نذر ہوا پھر ہمارا خواب نیا

نئے جمال سے ہوگا طلوع چہرے پر
دیارِ شب سے گزرتے ہی آفتاب نیا

ابھی سمیٹ رہا تھا میں دن کے ریزوں کو
کہ میری روح میں کھلنے لگا عذاب نیا

بس ایک عجزِ ہنر ہے متاعِ فن ورنہ
غزل نئی ہے ہماری نہ انتساب نیا!

فسونِ شب ہے تری سمت پھر لپکنے کو
اجال اپنی نگاہوں میں کوئی خواب نیا!

مجھے خبر ہے کہ اس پتھروں کی بستی میں
مری صداؤں کا کیا آئے گا جواب نیا

گزر گیا یونہی عباس ابرِ ساون کا
وجود و دشت پہ برسے بنا سحاب نیا

غلام محمد ناصر

پھر وہی کہنے لگے تو مرے گھر آیا تھا
چاند جن چار گواہوں کو نظر آیا تھا

رنگ چہروں نے چنے آپ سے ملتے جلتے
اور بتاتے بھی نہیں کون ادھر آیا تھا

بوند بھی تشنہ آنچل پہ نازل نہ ہوئی
ورنہ بادل تو بلندی سے اتر آیا تھا

دل نے اک عمر جسے خون سے سینچا وہ چمن
ایک آنچل کے کنارے پہ اتر آیا تھا

بھول بیٹھے ہیں نئے خواب کی سرشاری میں
اس سے پہلے بھی تو اک خواب نظر آیا تھا

سوئے ہوئے جذبوں کو جگانا ہی نہیں تھا
اے دل وہ محبت کا زمانہ ہی نہیں تھا

جلتے تھے چراغ اور دہک اٹھی تھی کلیاں
گو سب کو خبر تھی اسے آنا ہی نہیں تھا

دیوار پہ وعدوں کی امربیل چڑھا دی
رخصت کے لئے اور بہانہ ہی نہیں تھا

اڑتی ہوئی چنگاریاں سونے نہیں دیتیں
روٹھے ہوئے اس خط کو منانا ہی نہیں تھا

نیندیں بھی نظر بند ہیں تعبیر بھی قیدی
زنداں میں کوئی خواب سنانا ہی نہیں تھا

پانی تو ہے کم نقل مکانی ہے زیادہ
یہ شہر سرابوں کا بسانا ہی نہیں تھا

فضا ابن فیضی

پہلو بہ پہلو ، موج بہار اور آئنہ
شاخ اور پھول دست نگار اور آئنہ

سنجیدگی طبع بزرگوں کی مصلحت
بچوں کا کھیل مشت غبار اور آئنہ

چہرے پہ جو خراشیں ہیں ان کا حساب کر
تو اور داغ دل کا شمار اور آئنہ

کیا بات ہے کہ آج وہ اتنا اداس ہے
یہ موسم شکست و فشار اور آئنہ

ہیں تیرے خط و خال تو اس آئینے میں گم
ماضی کے طاقچے سے اتار اور آئنہ

کس نے چرالیں صورتیں اس کی کہ یوں ہوا
بے چہرگی کے دکھ سے فگار اور آئنہ

مشاطہ قلم بھی ہنر مند ہے بہت
اک اک ورق ہے زانو یار اور آئنہ

کب سے فضا میں اہل نظر کی تلاش میں
پھرتا ہوں لے کے سنگ عیار اور آئنہ

فیاض فتح پوری

مقتل میں بن کے باعث تشہیر بول اٹھی
ڈوبی مرے لہو میں تو شمشیر بول اٹھی

دل سر فراز دولت کونین ہو گیا
خلوت میں مجھ سے جب تری تصویر بول اٹھی

لفظوں کو کوئی قوت گویائی دے گیا
کاغذ پہ تیرے ہاتھ کی تحریر بول اٹھی

ہونٹوں پہ رقص کرتی رہیں مسکراہٹیں
چہرے سے اضطراب کی تنویر بول اٹھی

دانشوران شہر جو خاموش ہو گئے
فیاض میرے پاؤں کی زنجیر بول اٹھی

قاضی اعجاز محور

اپنے ہاتھوں سے کوئی پتھر تراشوں گا کبھی
پوچھتے ہیں لوگ کیوں اصنام سوچوں گا کبھی

آج تو کاغذ پہ مجھ کو کھینچنے دو خد و خال
جان بھی ممکن ہوا تو ان میں ڈالوں گا کبھی

کیف دیتے ہیں بہت خاموشیوں کے سلسلے
آج رہنے دو مجھے خاموش بولوں گا کبھی

پھینک کر پتھر صداؤں کو ابھی سنتا ہوں میں
اپنے اندر کے کنویں میں تھک کے جھانکوں گا کبھی

میں کہ اک برگد ہوں سونی رہگزر کے موڑ پر
اپنے سائے میں سمٹ کر آپ بیٹھوں گا کبھی

روز اک گجرا سرہانے رکھ کے سو جاتا ہوں میں
اس نے لکھا تھا ترے خوابوں میں آؤں گا کبھی

چاہتیں کس طرح دھندلاتی ہیں ڈھلتی شام میں
ایک البم میں لگی تصویر دیکھوں گا کبھی

ایک جھونکا تھا ہوا کا جس سے ٹکرایا تھا میں
یہ تو سوچا ہی نہ تھا اس طرح بکھروں گا کبھی

مل رہی تھیں دو نگاہیں ریل کے چلنے سے
وہ بچھڑنے کی گھڑی محور نہ بھولوں گا کبھی

قائم نقوی

ذہن میں صورت سمائی اور ہے
دل نے اک محفل سجائی اور ہے

پیش منظر میں بھی پس منظر کو دیکھ
بات آج اس نے سنائی اور ہے

بندگی کی حاصل دنیا نہ جان
زندگانی کی کمائی اور ہے

خون پسینہ تو بہا دہقان کا
فصل اٹھی تو بٹائی اور ہے

سب کو اپنا یار ہرگز مت سمجھ
ربط ہے اور آشنائی اور ہے

حرف کاغذ پر لکھا مٹ جائے گا
خون دل کی روشنائی اور ہے

نیکیوں کو ڈال دیں دریاؤں میں
اس بھلائی میں بھلائی اور ہے

خواب آخر خواب تھا کیا جاگتے
لاش دریا میں بہائی اور ہے

قتیل شفائی

ہر روز جو اب وقت پہ گھر جانے لگے ہو
تم مجھ کو اکیلے سے نظر آنے لگے ہو

کس کام کی یہ زندگی بے لذت عصیاں
بے لطف ثوابوں کی سزا پانے لگے ہو

دیوانہ تو سب اہل محبت کا لقب ہے
پھر کیوں تم اس اعزاز سے گھبرانے لگے ہو

بہتر ہے اسے گھر کے کسی طاق پہ رکھ دو
ٹوٹا ہوا دل لے کے کہاں جانے لگے ہو

باہیں وہ حمائل ہیں کسی اور گلے میں
تم جن کے لئے چوڑیاں بنوانے لگے ہو

آشوب نظر سے بھی پھڑکتی ہے کبھی آنکھ
تم یہ نہ سمجھنا اسے یاد آنے لگے ہو

تم نے جو قتیل آج تلک مانا ہے الزام
لگتا ہے کہ اب اس سے مکر جانے لگے ہو

قتیل شفائی

گزرے دنوں کی یاد برستی گھٹا لگے
گزروں جو اس گلی سے تو ٹھنڈی ہوا لگے

مہمان بن کے آئے کسی روز اگر وہ شخص
اس روز بن سجائے مرا گھر سجا لگے

جب تشنگی کی آخری حد پر ملے کوئی
آنکھ اس کی جام اور بدن میکدہ لگے

میں اس لئے مناتا نہیں وصل کی خوشی
مجھ کو رقیب کی نہ کہیں بد دعا لگے

دریا میں ہے بس ایک تھپیڑے کا انتظار
شاید یونہی سفینہ کنارے پہ جا لگے

وہ قحط دوستی کا پڑا ہے کہ ان دنوں
جو مسکرا کے بات کرے آشنا لگے

ایک ایسی خوش جمال پری اپنی سوچ ہے
جو سب کے ساتھ رہ کے بھی سب سے جدا لگے

دیکھا یہ رنگ بیٹھ کے بہروپیوں کے بیچ
اپنے سوا ہر ایک مجھے پارسا لگے

عمریں گنوا کے پاتے ہیں شہرت جو یہ قتیل
وہ بھی کسی رئیس کی اب داشتہ لگے

ترک وفا کے بعد یہ اس کی ادا قتیل
مجھ کو ستائے کوئی تو اس کو برا لگے

قیوم طاہر

خواب ایسے کہ گئی رات ڈرانے لگ جائیں
درد جاگے تو سلانے میں زمانے لگ جائیں

ہم وہ نادان ہواؤں سے وفا کی خاطر!!!
اپنے آنگن کے "چراغوں" کو بجھانے لگ جائیں

آس میکے جو کسی کھوئے جزیرے کی کبھی
تیری بانہیں مجھے ساحل پہ بلانے لگ جائیں

تھوڑے گیہوں ابھی مٹی پہ رکھے رہنے دو
وہ پرندے کہ کبھی لوٹ کے آنے لگ جائیں

چاہے رونے کی ہو آواز ذرا شور تو ہو
آؤ سوئے ہوئے بچوں کو جگانے لگ جائیں

کوئی منظر نہ رلائے تو یہ اپنی آنکھیں
رنگ راتوں کے اجالوں میں ملانے لگ جائیں

کوئی دشمن نہ ہو ان کا تو یہ ایذا پرور
اپنے خیموں پہ ہی تیروں کو چلانے لگ جائیں

قمر سنبھلی

جو لمحہ میرے تخیل کی حد میں آئے گا
مجھے یقیں ہے قلم کی بھی زد میں آئے گا

دعا تو مانگ رہے ہو تم آندھیوں کی مگر
تمہارا گھر بھی بگولوں کی زد میں آئے گا

کہاں کہاں سے ہٹاؤ گے اب تم آئینے
وہ ایک عکس ہر اک خال و خد میں آئے گا

میں فن نہ سیکھ سکا ہاں میں ہاں ملانے کا
ہر اک بیان یہاں میری رد میں آئے گا

لپیٹ لونگا میں سر سے تمازتوں کی ردا
سمٹ کے سایہ بھی جب اپنے قد میں آئے گا

جلائے رکھنا لبوں پر چراغ اسم سدا
تمہارے کام یہ کنج لحد میں آئے گا

بہت سنبھل کے برتنا ہر ایک لفظ قمر
اگر وہ آج نہیں، کل سند میں آئے گا

قیوم مروت

دکھائی دیتا ہے ہر شخص مورتی کی طرح
کبھی کوئی تو ملے مجھ کو آدمی کی طرح

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کو کیا سمجھوں؟
وہ دوستی بھی تو کرتا ہے دشمنی کی طرح

اگرچہ زر نہیں رکھتا مگر یہ کیا کم ہے؟
کہ دل خدا نے دیا ہے کسی غنی کی طرح

اسی لئے میرے گیتوں میں سوز ہوتا ہے
کہ کھوکھلا ہوں میں اندر سے بانسری کی طرح

میرے خدا مجھے اک اور زندگی دے دے
یہ زندگی نہیں گزری ہے زندگی کی طرح

قاضی حسن رضا

اپنی انا سے برسرِپیکار میں ہی تھا
میدان کارزار میں تلوار میں ہی تھا

اپنے یقیں سے پار کیا پل صراط کو
حالانکہ شہر بھر میں گنہگار میں ہی تھا

بے برگ و بار کردیا سورج نے جب اسے
سوکھے ہوئے شجر کا خریدار میں ہی تھا

نام و نمود کے لئے بکتا رہا ضمیر
اہل ہوس میں صاحب ایثار میں ہی تھا

شہر ہوس کا لٹ گیا جب قافلہ رضا
اس قافلے کا قافلہ سالار میں ہی تھا

ڈاکٹر کوثر محمود

روپ نگر میں آنکھوں کا میلہ کتنے دن رہتا ہے
جسم سنہرا رنگ دھنک جیسا کتنے دن رہتا ہے

شیشہ دل پر ، لوح نظر پر ، یادوں کی دیواروں پر
نقش کسی بے نام تعلق کا کتنے دن رہتا ہے

جس بستی نے خود ہی سب چھتنار درختوں کو کاٹا
اس بستی پر بادل کا سایہ کتنے دن رہتا ہے

اوروں کو ٹھنڈک دینے میں اپنا پیکر جلتا ہے
صحرا میں کوئی شبنم جیسا کتنے دن رہتا ہے

اور بہت ہمراہی کوثر آکر ملتے جاتے ہیں
برگ خزاں چپ رستوں پر تنہا کتنے دن رہتا ہے

کلیم ظفر

دل ہی کرتا ہے اعتبار دل
کر رہا ہوں میں انتظار دل

لوٹ آئے گی پھر وہ رونق شام
لوٹ آئے گی پھر بہار دل

بے قراری کو ہی قرار آئے
لوٹ لے پھر کوئی قرار دل

کبھی کچھ لکھ کے میں نکل آیا
ورنہ آساں نہ تھا فشار دل

لوٹ آتا ہے کاروان شوق
بیٹھنا چاہیے جب غبار دل

گلنار آفریں

دل کو جب ترک محبت کا خیال آتا ہے
اک اندھیرا سا ان آنکھوں میں سما جاتا ہے

دن کے ڈھلتے ہی تیری یاد کے آئینے میں
شفق شام کا ہر عکس نظر آتا ہے

جاگتی آنکھوں سے ہر رات میں سو جاتی ہوں
روز خوابوں کے جزیروں میں کوئی آتا ہے

کشت احساس کو دیکر وہ نئی رت کی نوید
ایک جھونکے کی طرح دل سے گزر جاتا ہے

ظلمت و نور میں ہے ربط و تسلسل کتنا
رات ڈھلتی ہے تو خورشید نکل آتا ہے

ہرقدم جس نے دیا مجھ کو فریب منزل
اب وہی رمز وفا آن کے سمجھاتا ہے

جس کے آنے سے کھلے تھے مری الفت کے کنول
اس کے جانے سے دل زار بجھا جاتا ہے

بھول بھی جاؤ محبت کے سہانے سپنے
دل گلنار یہ گلنار کو سمجھاتا ہے

گفتار خیالی

لوگ گرچہ لے کے آئے منگے منگے آئینے
ہر طرف بے چہرگی تھی کیا دکھاتے آئینے

ہو گئے تحلیل جب اجسام تو ایسا ہوا
بیتنے والے ہر اک پل نے اٹھائے آئینے

یا شکستہ چہرگی ہے یا ہے آئینوں کا نقش
عکس بھی اب تو نہیں سالم دکھاتے آئینے

تیرگی میں آئینوں پر حسرتیں ہی بجھ گئیں
روشنی کا دور ہوتا، جگمگاتے آئینے

جس طرح چہرے ہیں ان کے عکس بھی ویسے ہی ہیں
جھوٹ کے اس دور میں ہیں کتنے سچے آئینے

جابجا تنصیب آئینہ مناسب ہی نہیں
دیدہ عبرت اگر ہوتا، دکھاتے آئینے

عکس کھو جائیں گے ان کو آب کیسے دیجئے
آئینہ گر کیوں اٹھا لائے، پرانے آئینے

سوچ کے ویراں کھنڈر میں زندگی کے سامنے
ہم لئے بیٹھے رہے گفتار اندھے آئینے

گوہر ہوشیارپوری

ادھر کو جاتی ہوئی ہواؤ اسے نہ کہنا
کہاں وہ پہلے سا اب لگاؤ اسے نہ کہنا

اسے نہ کہنا کہ سبز موسم گزر چکے ہیں
پرندگاں کا ہے چل چلاؤ اسے نہ کہنا

اسے نہ کہنا وہ تیز دریا اتر گئے ہیں
اجڑ گئے ہیں وہ اب پڑاؤ اسے نہ کہنا

اسے نہ کہنا چراغ ساحل کا بجھ گیا ہے
فقیر کھے بھی گئے ہیں ناؤ اسے نہ کہنا

وہ ساری ریتیں وہ ساری رسمیں بدل گئیں ہیں
گئے پرانے وہ رکھ رکھاؤ اسے نہ کہنا

فضا میں کب کی بہاگ کی دھن چھڑی ہوئی ہے
وہ خواہشیں ہیں نہ اب وہ چاؤ اسے نہ کہنا

وہ دوریاں ہوں کہ منزلیں ہوں حضوریوں کی
بجان و دل ہے وہ ہر بھاؤ اسے نہ کہنا

محسن احسان

یہ اطمینان دل کو ہے کہ ہم گھر بار رکھتے ہیں
شکستہ ہیں مگر اپنے در و دیوار رکھتے ہیں

جدا ہے مفلس و زر دار سے ملنے کا پیمانہ
ہر انساں کے لئے ہم اک الگ معیار رکھتے ہیں

وہی ہیں ان دنوں مقبول تمثیل سیاست میں
جو سارے کھیل میں اک مرکزی کردار رکھتے ہیں

بہا کر خون بھائی کا لہو میں تر نکلتے ہیں
بغل میں ہم ہمیشہ خنجر خونخوار رکھتے ہیں

بیان صد کو حرف ریا سے کاٹ دیتے ہیں
نیام مخبری میں جھوٹ کی تلوار رکھتے ہیں

ہمیں کچھ غم نہیں گر ریت پر پاؤں سلگتے ہیں
کہ ہم سر میں ہوائے کوچہ دلدار رکھتے ہیں

ہمارے ہاتھ خالی ہیں ہماری آنکھ بھوکی ہے
اگرچہ جیب میں ہم درہم و دینار رکھتے ہیں

ہمارا حال ہے محسن یہ اب اقوام عالم میں
ضمیر بے ضمیراں اور دل بیمار رکھتے ہیں

محشر بدایونی

کتنا معتبر ٹھہرا اس زمیں سے پیار اپنا
مر کے بھی ہے مٹی سے رشتہ استوار اپنا

جب بھی غم کے ہوں سائے دفعتاً یہ بھر آئے
آنکھ سے زیادہ ہے کون غمگسار اپنا

اپنے ہیں یہی اوقات عمر کی یہی سوغات
ہے شب امید اپنی روز انتظار اپنا

کس کو ہے یہ اندازہ جاں پہ کیا گزرتی ہے
لب ہیں نغمہ ریز اپنے دل ہے اشک بار اپنا

اپنا روزگار زیست گرمی سخن سے ہے
حرف اپنا ہیں آزار حرف ہی قرار اپنا

اب یہ چال ہے گویا ہم سے وہ نہیں واقف
جاں نثار لوگوں میں تھا کبھی شمار اپنا

پہنچے اپنے رزم آرا بارشوں میں تیروں کی
ہار کر نہیں لوٹا کوئی شہسوار اپنا

کوئی باد وحشت ناک کتنی ہی اچھالے خاک
ہم نہ جائیں گے ہرگز چھوڑ کر دیار اپنا

زد پہ ہیں دل وجاں بھی دامن وگریباں بھی
کچھ پہ زور ان کا ہے کچھ پہ اختیار اپنا

محشر بدایونی

عجب سانحے خستہ جانوں کے تھے
زمینوں پہ خواب آسمانوں کے تھے

بہت فن سے رہنا پڑا باخبر
ہجوم اس قدر مدح خوانوں کے تھے

اب ان پر ہے ویرانیوں کا گزر
جو رستے کبھی کاروانوں کے تھے

دلوں کی حکایات کم تھیں یہاں
فسادات برپا زبانوں کے تھے

تہی دست ہے ان کی اب شاخ شاخ
کبھی جو شجر آشیانوں کے تھے

سخن داں تھے وہ بھی جو قصداً یہاں
قصیدہ سرا حکمرانوں کے تھے

بہار آئی اور بندھ گئے اپنے پر
یہی دن تو اونچی اڑانوں کے تھے

محل ہل گئے جن کی آواز سے
مکیں وہ شکستہ مکانوں کے تھے

ہواؤں نے جن کو کیا مشتعل
چراغ اچھے خاصے گھرانوں کے تھے

ملال اپنے گزرے دنوں کا تھا کم
خیال آنے والے زمانوں کے تھے

ہماری یہ ساری تھی مشکل کہ ہم
مزاج آشنا مہربانوں کے تھے

محسن بھوپالی

روا ہے اک ستم ناروا کو دیکھتے ہیں
کبھی فلک، کبھی دست دعا کو دیکھتے ہیں

اجاڑ رستوں پہ وحشت کا رقص جاری ہے
کھنڈر کی شکل میں شہر سبا کو دیکھتے ہیں

خموشیوں میں بھی چیخیں سنائی دیتی ہیں
سلگتی کوکھ، دریدہ ردا کو دیکھتے ہیں

جوان لاشے اگلتا ہے ہر نیا سورج
حصار شام میں اہل وفا کو دیکھتے ہیں

ہمیں جواب میں اپنا سوال ملتا ہے
خضر کی شکل میں کوہ ندا کو دیکھتے ہیں

وہ دے رہے ہیں ہمیں انقلاب نو کی نوید
اڑا کے خاک، جو سمت ہوا کو دیکھتے ہیں

محسن زیدی

ایسے پت جھڑ میں کہاں کوئی ٹھکانا اپنا
اب وہ پتے ہی نہیں جن پہ تھا تکیہ اپنا

مدتوں سے ہمیں اپنی بھی نہ پہچان رہی
جانے کس طاق پہ رکھ آئے ہیں چہرا اپنا

اک تعلق ہے ہمیں غم سے کسی کا غم ہو
ہر دکھے دل سے ہے نزدیک کا رشتا اپنا

تہ بہ تہ اب جہاں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک کتبے پہ وہیں نام لکھا تھا اپنا

کم ہی احساس کو پیرایہ اظہار ملا
آسکا کچھ ہی سر عام دفینا اپنا

اب کڑی دھوپ ہے اور در بدری کا عالم
لے گیا سر سے وہ جاتے ہوئے سایا اپنا

سنگ زاروں میں دکھائی کہاں دے گا محسن
ڈھونڈنے نکلے تو ہو نقش کف پا اپنا

محمد اطہر مسعود

دل میں ہی رہے لب پہ مگر بات نہ آئے
ہم کو تو مری جاں یہ کمالات نہ آئے

لے جائے گی سب کچھ یہ بہت دور بہت دور
روکو کہ ابھی موج خیالات نہ آئے

اوروں کا تو کیا ذکر کہ نادان بہت تھے
کچھ اپنی سمجھ میں بھی وہ حالات نہ آئے

تنہا یونہی آوارہ خرامی نہیں اچھی
کیا لطف سفر کا ہے وہ جب ساتھ نہ آئے

ہم خود ہی نہ کھو جائیں اسے ڈھونڈتے اطہر
اور ڈھونڈتے رہنے پہ بھی وہ ہاتھ نہ آئے

محمد احمد رمز

کیسے ہیں خلوت کے ساتھی کچھ تو سوچیں یہ
ساری ساری رات میں جاگوں آنکھ نہ کھولیں یہ

گرتی گگر پر لوگ کھڑے ہیں نیچے گہرا غار
نقش بھی شائد اپنے نہ چھوڑیں مٹتی قدریں یہ

دشت پہ ہر سو پھیل گئے ہیں بادل پی کر دھوپ
ذرے تو بیچارے ذرے کیسے چمکیں یہ

چیختے لمحے چاروں طرف ہیں ایسی بھیانک رات
صبح تلک بھی بند نہ ہوں گی کیا آوازیں یہ

تھے میرے ہمراہ سفر میں زہریلے کردار
میں نے دامن کھینچ لیا اب کچھ دن بھٹکیں یہ

میرے خواب مری غزلوں میں بنے مرا اسلوب
صدیوں بعد ایک آدھ کو ملتی ہیں تعبیریں یہ

نوزائیدہ غنچوں پر بھی کرنا کرم یارب
مجھ سے زیادہ باغ ہنر میں نکھریں مہکیں یہ

اس کے علاوہ اور نہیں کچھ مصرف عرش و فرش
ہیں میری محراب دعائیں جلتی شمعیں یہ

رمز نہیں لوگوں میں یہاں اب توقیر سادات
آگ دو دوں ہاتھ پہ رکھ کر پھر بھی نہ مانیں یہ

محمد شہزاد بٹ

جب سے دیکھا ہے اندھیرا صبح کے آثار پر
دل مسلسل رو رہا ہے مطلع انوار پر

نیند سی آنے لگی ہے وقت کے زندان میں
کاٹ ڈالے کس نے میرے جسم کے بیدار پر

جھوٹ کے ماحول میں سچ بولتا رہتا ہوں میں
کون اب پہرہ لگائے گا مرے اظہار پر

رہبروں کے روپ میں جب تک لٹیرے آئیں گے
زندگی کا بین ہوگا جبر کی دیوار پر

اس ہجوم بے وفا میں جب وفا تقسیم کی
میں کبھی پورا نہیں اترا ترے معیار پر

پیار سے شہزاد سب کا نام ہم لیتے ہیں
کیا خبر تھی حرف آئے گا کسی کردار پر

محمد مجیب احمد

وہ ظلم کرتے ہیں یوں جس کی انتہا ہی نہیں
حساب لینے کو جیسے کوئی خدا ہی نہیں

اجڑ کے بستیاں بستی ہوئی نئی دیکھیں
اجڑ کے خانہ دل اپنا پھر بسا نہیں

وہ آئیں گھر تو بٹھائیں گے سر پہ آنکھوں پر
نہیں ہے فکر کوئی آج بوریا ہی نہیں

کبھی تو پوچھو کہ میں بھی زبان رکھتا ہوں
نہ سمجھو ایسا مرا کوئی مدعا ہی نہیں

بناتے جاتے ہیں ہر روز اک نشیمن ہم
گرے جو برق سمجھتے ہیں کچھ جلا ہی نہیں

مجیب سارا زمانہ مرا مخالف ہے
جہاں میں جیسے کہ مجھ سے کوئی برا ہی نہیں

محمد مشتاق آثم

نسب کی ساری نجابت اسی کلاہ میں ہے
جسے پہن کے زمانہ تری نگاہ میں ہے

سخن طراز پہ تحسین ذو معروں پر سے
مگر جو بات غضور کی ایک واہ میں ہے

نہ دے اذان تو رب صبح تک نہیں کرتا
ہے کیسا نور جو اک صورت سیاہ میں ہے

کوئی تو بات تھی جس پہ بہشت تج دی تھی
عجب خمار سا اس لذت گناہ میں ہے

ٹھہر سکے گا نہ مقابل سکندر و دارا
بلا کا زور مرے لشکر و سپاہ میں ہے

امیر وقت کی نیت کہیں پہ بدلی ہے
تبھی تو ملک ابھی جبر کی پناہ میں ہے

ہیں بے کنار تری وسعتیں حدود و قیود
تمام عالم امکاں تری نگاہ میں ہے

خواب دیکھوں کہ لڑوں خواب کی تعبیر کے ساتھ
گفتگو رہتی ہے اکثر مری تقدیر کے ساتھ

گرد باہوں کا تھا حلقہ مرے یوں جیسے کہ
بعد مدت کے ملے ویر کوئی ویر کے ساتھ

خام تھا عنصر خاکی سو سنبھلتا کیسے
اس لئے کچا گھڑا ڈوب گیا ہیر کے ساتھ

کیسے جانیں انہیں ہم اہل وفا اہل جنوں
جن کا مقتل سے تعلق ہے نہ زنجیر کے ساتھ

بے سبب خیمے سر آب نہیں جلتے گئے
تھا یقیناً لگا کچھ اور بھی کچھ تیر کے ساتھ

ان سے تو آنکھ ملانا ہی بڑا مشکل ہے
ہے کسے تاب چلے دور تلک میر کے ساتھ

محمد مختار علی

بے بسی بڑھ گئی اگر حد سے
لوگ سر پھوڑ لیں گے معبد سے

اک ذرا دیر کھل کے رونے سے
میری آنکھوں کے ڈھل گئے عدسے

سیڑھیوں پر ہیں پھر بھی چھوٹے ہیں
چند بالشتیے مرے قد سے

کیسے جیون کٹے وہاں کہ جہاں؟
جبر بڑھ جائے صبر کی حد سے

بٹ گئے مختلف گروہوں میں
ہٹ گئے جب بھی اپنے مقصد سے

اس کی چھوٹی سی بات سے مختار
قد مرا بڑھ گیا مرے قد سے

محمد ممتاز راشد

اب بھی ہے سوالات کا معیار سلامت
اب بھی ہیں ترے شہر میں خود دار سلامت

برسے ہیں مرے صحن میں افلاس کے پتھر
صد شکر کہ ہے شیشۂ کردار سلامت

طوفان کا چہرہ نہ کبھی مجھ سے چھپے گا
جب تک ہے مرا روزنِ دیوار سلامت

ہر چند خریدار کے سر پر ہے گرانی
لیکن ہے ابھی گرمئ بازار سلامت

ہر شاخ چمن زار کی شاداب رہے گی
جب تک ہے مرا جذبۂ ایثار سلامت

یہ رنگ مکافات بھی کیا خوب ہے راشد
اشراف ہیں مجروح، غلط کار سلامت

محمد اصغر سلیم

سفر کی دھول میں وہ آئنہ سا لگتا ہے
حصار گرد میں تازہ ہوا سا لگتا ہے

شب فراق کی حد تک تو کوئی بات بھی ہے
مگر یہ لمحہ جو ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے

وہ لفظ جس سے مجھے اجتناب کرنا تھا
تیرے حضور وہی برملا سا لگتا ہے

مرے دماغ پہ گہری ہے چھاپ پھولوں کی
مجھے توخار بھی آراستہ سا لگتا ہے

نہ اس میں ہجر کی گرمی نہ وصل کی ٹھنڈک
ہمارے حال کا موسم نیا سا لگتا ہے

تری زبان پہ جو لفظ بن گیا دشنام
مری زبان پہ حرف دعا سا لگتا ہے

جو میرے سانس کی ہر موج کے حصار میں ہے
میرے بدن میں مرا دل دیا سا لگتا ہے

ہماری بات سبھی کی زباں پہ تھی اصغر
ہمارا شعر تو پہلے کہا سا لگتا تھا

محمد یونس فریدی

گر کبھی فرصت ملے تو آئینوں کو دیکھنا
اپنی انکھوں میں مچلتے رتجگوں کو دیکھنا

رابطے قائم ہیں جن سے دو دلوں کے درمیاں
سلسلے ہیں پیار کے ان سلسلوں کو دیکھنا

کر گیا پامال جن کو آج کا اندھا سماج
خاک میں لتھڑے ہوئے ان پیکروں کو دیکھنا

چھپ گئے ہیں جن کے پیچھے چاند کے سب خدوخال
اودے اودے گہرے گہرے بادلوں کو دیکھنا

جب کبھی تیرا گزر ہو پتھروں کے دیس سے
ہوگئے تھے موم جو ان پتھروں کو دیکھنا

ظلم کی چکی میں پس کر جو ابھی خاموش ہے
ایسے مفلس کی ذرا تم حسرتوں کو دیکھنا

جب کبھی نکلو سفر پر بادلوں کے دوش پر
تم ذرا پانی میں ڈوبی بستیوں کو دیکھنا

کیا ہوئیں قسمیں وہ یونس' عہدو پیاں کیا ہوئے
لمحہ لمحہ ٹوٹتے ان بندھنوں کو دیکھنا

محمد وحید انصاری

چہرے پہ رنگ و نور کی گل کاریاں بہت
جھانکو کبھی جو دل میں تو چنگاریاں بہت

گھر جو کسی کے جاؤ تو ماتھے پہ سلوٹیں
رستے میں مل گئے تو وضعداریاں بہت

پیاسے شجر کی سمت کوئی دیکھتا نہیں
ہونے کو ہو رہی ہیں شجرکاریاں بہت

آسان کب تھا ترک محبت کا مرحلہ
مانا کہ قربتوں میں تھیں دشواریاں بہت

پل بھر کی دوستی میں بڑا اطمینان ہے
برسوں کی دوستی سے ملیں خواریاں بہت

جی بھر گیا وحید مذاق وفا سے اب
دیکھی ہیں دوستوں کی وفاداریاں بہت

محیط اسمٰعیل

ابھی رہتا ہے دوجا رخ مروت دیکھنے والے
مجھے بھی سن ! مرا حسن سماعت دیکھنے والے

فقط اک رسم تھی تلقین کی ، سو ہو گئی پوری
ہیں خود سنجیدہ کب میری متانت دیکھنے والے

کسی کو شوق تو ہوتا نہیں ہے تلخ ہونے کا
ہے پس منظر بھی کچھ ، میری طبیعت دیکھنے والے

کہیں ایسا نہ ہو ، دونوں ہی اک تصویر بن جائیں
مجھے حیراں نہ کر باچشم حیرت دیکھنے والے

عبادت کام کو سمجھیں تو کوئی بھی گھڑی کیا ہے!
خدا سے دور ہیں کتنے مہورت دیکھنے والے

تھی یہ بھی چال دشمن کی ، پلٹ کر سر پہ آپہنچا
بہت معصوم تھے مال غنیمت دیکھنے والے

خدا خوفی بجائے خود بڑی دولت ہے دنیا میں
کسی کا حق نہ چھین اپنی ضرورت دیکھنے والے

محیط اچھا ہے اندازہ سفر کچھ بھی نہ ہو تم کو
کہ منزل دیکھتے کب ہیں مسافت دیکھنے والے

مسعود مضطر ہزاروی

مانا کہ اس کے شہر میں محمل کدے بھی تھے
سڑکوں پہ کتنے جسم برہنہ پڑے بھی تھے

کچھ نے بنا لئے تھے محل جانتا ہوں میں
کچھ لوگ جھونپڑوں سے نکالے گئے بھی تھے

ہونٹوں پہ فرد فرد کے تعریف تھی ضرور
سینوں میں نفرتوں کے مگر شالے بھی تھے

طوفاں بھی کچھ شدید تھا یہ بات ٹھیک ہے
کچھ نا خدا کے پست مگر حوصلے بھی تھے

سورج کرن کرن تھا دہکتا ہوا الاؤ
اس پر یہ ظلم آنکھ میں نیزے گڑے بھی تھے

نظروں پہ زرد چاند کا چہرہ بھی بار تھا
آنکھوں میں انتظار کے سپنے سجے بھی تھے

زخموں کے سنگ سنگ تھیں لہریں بھی درد کی
نقطوں کے ساتھ ساتھ رواں دائرے بھی تھے

مضطر یہ اور بات کہ چپ چپ تھے لوگ بھی
ذہنوں میں اضطراب کے کچھ سلسلے بھی تھے

مختار اجمیری

ہم نے اک شیش محل جب سے بنا رکھا ہے
بارش سنگ نے ہر دل کو ہلا رکھا ہے

آگ اور خاک کی اک جنگ مسلسل ہی رہی
اک بناتا ہے مکاں اک نے جلا رکھا ہے

سوچتا ہوں کہ جیئے جاؤں، مگر، کیوں، آخر
اس جیئے جانے میں کیا خاک مزا رکھا ہے

وہ یہ کہتا ہے زمیں میری ہے تیری تو نہیں
اس زمیں نے تو فلک سر پہ اٹھا رکھا ہے

حسن کی چاہ میں یہ عشق بھی کافر نکلا
نام اصنام کا ظالم نے خدا رکھا ہے

حادثے ہوتے ہیں مختار جہاں رہ رہ کر
ہم نے کس موڑ پہ گھر اپنا بنا رکھا ہے

مرتضیٰ برلاس

اب تو وہ شخص بھی تیرے لئے انجانا ہے
جس کی نسبت سے تجھے شہر نے پہچانا ہے

آج اٹھکیلیاں کرتی ہے جو موج ساحل
کل کو اس نے تجھے منجدھار میں لے آنا ہے

ایک وہ بات جو ہونٹوں پہ نہ آئی ہے کبھی
عمر بھر ہم نے اسی بات پہ پچھتانا ہے

مختصر اتنی ہے روداد شگفت گل کی
شاخ پہ کھلتے ہی گلدان میں سج جانا ہے

اب تو دوری ہے مگر پہلے بھی قربت کب تھی
وہ بھی دن بیت گیا یہ بھی گزر جانا ہے

حکم ہے اس کا کہ ناخن مرے کھینچے جائیں
کوئی گتھی مجھے شاید ابھی سلجھانا ہے

وہ نہ ملنے کے کرے لاکھ بہانے لوگو
دل وہ ضدی کہ کسی طور نہ مانے لوگو

ہم نے کوشش تو بہت کی کہ اجالا ہو جائے
دیپ جلنے نہ دیا تیز ہوا نے لوگو

تم نئی نسل کے مجرم ہو حقیقت یہ ہے
جرم تسلیم کرو اپنا پرانے لوگو

ہم بھی دے سکتے تھے ہر اینٹ کا پتھر سے جواب
ایسا کرنے نہ دیا خوف خدا نے لوگو

تم میں وہ شخص ہی حق گو ہے یہ تم جانتے ہو
جس کے بارے میں تراشے ہیں فسانے لوگو

ہے مرے پاس اثاثہ مری بدحالی کا
میں بنالوں گا ہر اک گام ٹھکانے لوگو

مظہر بھوپالی

آہوں کے سوا دیدہ تر دیکھ رہے ہیں
بنتے ہوئے اشکوں سے گہر دیکھ رہے ہیں

پھوٹے گی کرن دل کے اجالوں سے کسی دن
چھٹ جائے گا اس دن جو اثر دیکھ رہے ہیں

مل جائے کوئی ان کا نشاں راہ میں ہم کو
رک رک کے سبھی گرد سفر دیکھ رہے ہیں

جل جائے گا اس آگ سے میرا بھی نشیمن
شعلوں کی تپش ہم جو ادھر دیکھ رہے ہیں

ہم ٹھوکریں منزل کے لئے کھائیں گے کب تک
تپتے ہوئے صحرا میں شجر دیکھ رہے ہیں

صیاد ہی بیٹھا ہے کوئی چھپ کہ فضا میں
نوچے ہیں فضاؤں میں جو پر دیکھ رہے ہیں

یہ کیسی شب غم ہے جو کٹتی نہیں مظہر
اک عمر سے ہم رنگ سحر دیکھ رہے ہیں

مظہر بخاری

یہ کیا ستم ہے گلاب جاگے نہ خواب جاگے
رہ وفا میں مسافرت کے عذاب جاگے

اس آس میں خود کو زندہ رکھا ہے تیرگی میں
ہماری دھرتی پہ صبح کا آفتاب جاگے

علم وفا کے اٹھائے نکلے ہیں مقتلوں سے
کہ عہد نو میں کوئی نیا انقلاب جاگے

جنھیں سمندر نے مدتوں غرق آب رکھا
بہار نو میں وہ پھول سب سطح آب جاگے

عجیب ویرانیاں تھیں مظہر اداس تھے سب
صبا نے غنچوں کو تھپکیاں دیں گلاب جاگے

مقبول ستنوی

بھری برسات میں اتنا نہ برسے
گرے ہیں جتنے آنسو چشم تر سے

رہیں سرگوشیاں شام و سحر سے
میں اب گھبرا گیا ہوں اس سفر سے

ستارہ زندگی کا ڈوبتا ہے
نہ اب باد صبا گزرے ادھر سے

نہ جانے کن خیالوں میں ہے گم وہ
شفق کو دیکھتا ہے چشم تر سے

جلا کے آشیانے کو چمن میں
یہ نفرت کی ہوا آئی کدھر سے

انہیں عرفان حاصل ہوگیا ہے
خود اپنی ہی نگر فکر و نظر سے

بڑے مقبول تھے جو لوگ یا رب
وہ کیسے گرا گئے اپنی نظر سے

منظر ایوبی

ہر رگ و پے میں اترتا ہوا نشتر دیکھوں
زندگی زہر ہے اس زہر کو پی کر دیکھوں

کیا اسی واسطے آنگن میں لگایا تھا درخت
رات دن سر پہ برستے ہوئے پتھر دیکھوں

کیسے اندازہ کروں شہر کی ویرانی کا
بارش سنگ میں کیا گھر سے نکل کر دیکھوں

دائرہ زیست کا ہر آن سمٹتا جائے
اور خوابوں کا یہ عالم کہ برابر دیکھوں

ایک عالم ہے تحیر کا نگاہوں پہ محیط
تجھ کو دیکھوں تو کسی اور کو کیونکر دیکھوں

داد فن دے کہ نہ دے یاد تو رکھے دنیا
رنگ ایسا تیری تصویر میں بھر کر دیکھوں

تو مری دسترس شوق سے باہر تو نہیں
آئینہ جب بھی اٹھاؤں ترا پیکر دیکھوں

شدت کرب سے ہے دل میں قیامت برپا
اس سے نمٹوں تو ترے شہر کا منظر دیکھوں

مقصود وفا

تمہارے ہجر کا انجام خوبصورت ہے
بہت اداس مگر شام خوبصورت ہے

پھر اس کے بعد یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے
یہ زندگی تو کوئی گام خوبصورت ہے

تو جس طرح سے حسیں ہے زمانے بھر سے الگ
اسی طرح سے ترا نام خوبصورت ہے

یہ سوچ کر ہی رکھا زخم کو ہرا میں نے
کہ عشق میں تو ہر اک کام خوبصورت ہے

نہیں ضروری کہ ہر بات کی وضاحت ہو
کہیں کہیں پہ یہ ابہام خوبصورت ہے

میں اس لئے نہیں دیتا صفائی اپنی وفا
مرے حریف کا الزام خوبصورت ہے

مظفر حنفی

ہم تو زندہ ہیں اجالے کو اندھیرا مان کر
تم بھی استعمال کرنا روشنی کو چھان کر

رات کو آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکا کیا
صبح نے ٹھوکر لگائی مجھ کو پتھر جان کر

سوچتے ہیں کیا کریں گے ہم کہ تھوڑی دیر میں
دشت بھی سو جائے گا کہرے کی چادر تان کر

پیاس کی شدت سے ہونٹوں پر جمی ہے ریت سی
آپ دریا بھاگ جاتا ہے مجھے پہچان کر

سرحدوں پر سر پٹکتی ہے مری لا سمتیت
وسعت ارض و سما مشکل مری آسان کر

لفظ و معنی مل گئے ترسیل سے جس رنگ میں
اے مظفر ختم ہے وہ رنگ تجھ پر آن کر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

جس چمن کی بہار لاحاصل
اس کے پھولوں سے پیار لاحاصل

عالم انتظار لاحاصل
یہ غم روزگار لاحاصل

جو بجھائے نہ تشنگی دل کی
جشن ابر بہار لاحاصل

زندگی کا مال کیا کہئے
ایک مشت غبار لاحاصل

دل کی وارفتگی معاذاللہ
جذبہ بے قرار لاحاصل

کتنے محلوں کے حوصلے ٹوٹے
نقش ناپائدار لاحاصل

منیر الزماں منیر

خوشبو کی طرح کل جو لباس بشر میں تھا
سب سے نظر بچا کے وہ میری نظر میں تھا

جو کچھ دیا تھا تم نے بہ یک جنبش نگاہ
وہ لمحہ عزیز مسلسل سفر میں تھا

اک اجنبی سے بزم میں یوں گفتگو رہی
محسوس یہ ہوا وہ کبھی میرے گھر میں تھا

اس واسطے عزیز ہوں سب کی نگاہ میں
زخموں کا کچھ حساب مری چشم تر میں تھا

اکثر بلندیوں سے رہی میری گفتگو
پرواز کا شعور مرے بال و پر میں تھا

پھولوں کی رت میں صحرا نوردی ملی منیر
میرا نصیب گردش شام و سحر میں تھا

ڈاکٹر ناصر اسلام

سلگتی شام میں اترے ، وہی دن ہیں
گذشتہ سال جو گزرے، وہی دن ہیں

شجر کے سائے میں ڈھلتے ہوئے موسم
تمہارے ساتھ جو بیتے ، وہی دن ہیں

نکل کر دور خوشبو کے تعاقب میں
تری گلیوں تلک آئے، وہی دن ہیں

شبوں کے پچھلے پہروں میں وہ آہٹ سی
جو نغموں کی طرح گونجے وہی دن ہیں

مری سانسوں کے اک آنگن میں، آنکھوں میں
جو پھولوں کی طرح مہکے ، وہی دن ہیں

وہی جو ساعت ہجراں میں گزرے ہیں
جو آنسو کی طرح ٹپکے ، وہی دن ہیں

تمہاری یاد میں پوروں سے پھسلے
ہماری آنکھ میں ٹھہرے نہیں وہی دن ہیں

دوبارہ لوٹ کر آئے ہیں راہوں میں
مثال کوہ غم کاٹے ، وہی دن ہیں

منیر جہلمی

ہر سو غموں کے سائے دکھائی دیئے مجھے
کیا کیا نہ تو نے دشت جدائی دیئے مجھے

وہ خواب تھے کہ آنکھ بھی پتھرا کے رہ گئی
کچھ غم برائے راہ نمائی دیئے مجھے

ایسا بھی وقت آن پڑا مجھ پہ اک گھڑی
سائے بھی اپنے دور دکھائی دیئے مجھے

پھر عالم سکوت رہا کس قدر عجیب
تنہائیوں کے شورسنائی دیئے مجھے

سونے دیا کہاں مجھے تیری صداؤں نے
پھر ان گنت سراب دکھائی دیئے مجھے

ہر آئینے کی آنکھ تھی جلوہ نما ابھی
اس کے منیر عکس دکھائی دیئے مجھے

منیر نیازی

جب میں اٹھا تو ساتھ اٹھا لاجواب دن
جب میں چلا تو ساتھ چلا میرے خواب دن

وہ جس کو میں سمجھتا رہا کامیاب دن
وہ دن تھا میری عمر کا سب سے خراب دن

دنیا کو چھوڑ دینا کسی خواب کے لئے
جس خواب سے پرے تھا کوئی اور خواب دن

آج اس کے ساتھ کیسے یہ پل میں گزر گیا
کاٹے سے کل جو کٹتا نہ تھا بے حساب دن

روشن تھی رات اس رخ روشن سے اے منیر
پر اس کی روشنی سے ہوا آفتاب دن

منیر نیازی

وہ جو اپنا یار تھا دیر کا کسی اور شہر میں جابسا
کوئی شخص اس کے مکان میں کسی اور شہر کا آبسا

یہی آنا جانا ہے زندگی کہیں دوستی کہیں اجنبی
یہی رشتہ کار حیات کا کبھی قرب کا کبھی دور کا

ملے اس میں لوگ رواں دواں کوئی بے وفا کوئی باوفا
کٹی عمر اپنی یہاں وہاں کہیں دل لگا کہ نہیں لگا

کوئی خواب اب بھی ہے یہاں جسے دیکھ سکتے ہو دیر تک
کسی دائمی شب وصل کا کسی مستقل غم یار کا

وہ جو اس جہاں سے گزر گئے کسی اور شہر میں زندہ ہیں
کوئی ایسا شہر ضرور ہے انہی دوستوں سے بھرا ہوا

یونہی ہم منیرؔ پڑے رہے کسی اک مکاں کی پناہ میں
کہ نکل کے ایک پناہ سے کہیں اور جانے کا دم نہ تھا

ناصر شہزاد

سلسلہ پریت ریت کا بعد' برہ میں کٹ گیا
شخص وہ اک عجیب تھا میری نظر سے ہٹ گیا

پی سے ملن کی بات کا ' تذکرہ تیاگ رات کا
چپ ری سکھی سکھی ترا دھیان کدھر رپٹ گیا

دین ہے میرا ہاشمی ' اموی میرے حریف ہیں
جھگڑا دو ' ایک اونٹ کا صدیوں سینوں میں بٹ گیا

رستے میں خامشی ' پہاڑ اور وہ ابر کی دھاڑ
باہوں کے گھیر میں کوئی آ کے سمٹ سمٹ گیا

کام نہ آسکیں ترے' تری یہ بے نیازیاں
تو ہی تھا دل کی سرخوشی تجھ سے ہی دل اچٹ گیا

نینوں کے بان چھوڑ کر ' انگ سر پر توڑ کر
او ری سکھی پیا پیا میرا جیا الٹ گیا

چہرے پہ میرے رات جب چہرہ وہ چاند سا جھکا
عکس بکھر کے جھیل کے جل سے لپٹ لپٹ گیا

بدلی نبھاؤ کی ڈگر ' پریتم نے پھیرلی نظر
پریتم سے پیار تھا بہت ' پریتم سے پیار گھٹ گیا

صبح سفر تو اور میں کار کی اگلی سیٹ پر
چڑیوں کا شور کوہ کے سبز بنوں میں اٹ گیا

تجھ سے بچھڑ بچھڑ گئے جنوں جگوں کی دھند میں
اب ترے وصال کا برسے بنا ہی چھٹ گیا

جب بھی کہیں ستم بڑھا جاگی تڑپ کے کربلا
سامنے ہر یزید کے نام حسین ڈٹ گیا

ناصر بشیر

آؤ اب ترک تمنا کا ارادہ کر لیں
زندگی الجھی ہوئی ہے ، اسے سادہ کر لیں

اب ملیں گے تو مری جان کسی خواب میں ہم
آ کہیں بیٹھ کے ہم آج یہ وعدہ کر لیں

تو چلا ہے تو ہمیں یونہی خیال آیا ہے
آج بادہ نہ سہی ، حسرت بادہ کر لیں

ہر طرف راستے بنتے ہی چلے جاتے ہیں
ہم سے درویش اگر خواہش جادہ کر لیں

آج موسم کا اشارہ ہے ، کوئی آئے گا
گھر کا آنگن نہ سہی، دل ہی کشادہ کر لیں

اپنی آنکھوں کا لہو دے کے بھی ہم سوچتے ہیں
لو چراغوں کی کسی طور زیادہ کر لیں

کوئی عریانی کا طعنہ تو نہ دے گا ناصر
آؤ اڑتی ہوئی مٹی کو لبادہ کر لیں

ناصر زیدی

شکست دل کی حکایت بیان کیسے کروں؟
حقیقتوں کو بتا ، داستان ، کیسے کروں؟

وہ بے خبر تو نہ تھا رسم عاشقی سے مگر
میں بے وفائی کا اس پر گمان کیسے کروں؟

کوئی تو ہوگا مرے غم خریدنے والا
ابھی سے بند غموں کی دکان کیسے کروں؟

مجھے تو اپنی خبر بھی نہیں ہے مدت سے
غم فراق میں اب تیرا دھیان کیسے کروں؟

ستارا بار نظر سے وہ دیکھتا ہی نہیں
زمین شعر کو میں آسمان کیسے کروں؟

مخالفت بھی ضروری ہے آگہی کے لئے
تو اپنے حق میں یہ سارا جہان کیسے کروں؟

جو میرے دل کی تہوں میں اتر نہیں سکتا
میں اپنے غم کا اسے ترجمان کیسے کروں؟

یہ دھوپ چھاؤں ہے تقدیر کا عمل ناصر
گلہ گزاری ہفت آسمان کیسے کروں؟

نجیب احمد

شیریں لبوں میں اہل بیاں گھر بنائیں گے
موقع ملا تو ہم بھی یہاں گھر بنائیں گے

ہم سر بلند ہونگے کھجوروں کے بھیس میں
پانی میں زیرِ دشت تپاں گھر بنائیں گے

اس خاک نم نژاد پہ شعلوں کا راج ہے
ہم لوگ اس زمیں پہ کہاں گھر بنائیں گے

یار اپنی اپنی گور کے پیچھے لگے تو ہیں
مٹی جہاں کی ہوگی وہاں گھر بنائیں گے

اک وہم کے خمیر سے اٹھتا ہے ہر خیال
قلب یقیں میں اہل گماں گھر بنائیں گے

ہم تہ نشین ٹھہریں گے جس روز اے نجیب
کچھ دائرے بر آب رواں گھر بنائیں گے

چراغ جلتے رہے شب سحر میں ڈھلتی رہی
یہ برف حدت انوار سے پگھلتی رہی

بدن کی جھیل پہ تاریکیوں کا راج رہا
تہوں میں دل کی کرن کروٹیں بدلتی رہی

رہی نہ رقص کناں کائنات میرے بعد
سسک سسک کے مگر گام گام چلتی رہی

جمی رہی مرے پیکر پہ برف ترک وفا
شرار بن کے مگر جاں بدن میں جلتی رہی

ہر ایک لفظ میں رقصاں رہا شعور حیات
نجیب مصرع موزوں میں زیست ڈھلتی رہی

ندیم شعیب

لہو در لہو کر پلا چاہتا ہوں
مرا حوصلہ دیکھ کیا چاہتا ہوں

کسی پر بھی یہ راز کھلتا نہیں ہے
وہ کیاچاہتا ہے میں کیا چاہتاہوں

تجھے یاد رکھوں نہ خود یاد آؤں
میں جینے کی ایسی سزا چاہتا ہوں

کوئی مصلحت ہے کہ روکے ہے رستہ
تمہارے سوا اور کیاچاہتا ہوں

دعاؤں کا وہ بھی صلہ چاہتی ہے
دعاؤں کا میں بھی صلہ چاہتا ہوں

نور بجنوری

گر پڑا ٹوٹ کے مہتاب تو پھر کیا ہوگا
منہدم ہو گئے سب خواب تو پھر کیا ہوگا

زندگی تونے مرے ناز اٹھائے ہیں بہت
پی لیا تونے بھی زہراب تو پھر کیا ہوگا

اہل دانش کے تو احسان بہت ہیں ہم پر
اہل دل ہوگئے نایاب توپھر کیا ہوگا

چند آنسو مری آنکھوں میں چھپے بیٹھے ہیں
یہ اگر بن گئے سیلاب تو پھر کیا ہوگا

قصر شاہی میں نہ لے جاؤ مجھے تم یارو
تج دیئے میں نے سب آداب تو پھر کیا ہوگا

نواز شاہد

میں ہوں خورشید اجالے میرے
مجھ سے مانگو نہ حوالے میرے

حسن شب کو بھی بچا کر رکھا
یوں تو دن رات اجالے میرے

ایک دریا کی طرح بہتا ہوں
کوئی تیور تو سنبھالے میرے

خود سے بھی آنکھ چرا رکھی ہے
کب کوئی بھید نکالے میرے

میں تری نیند سے بھر لوں آنکھیں
تو کبھی خواب چرالے میرے

جام جمشید تو کیا ہے شاہد
دیکھو مٹی کے پیالے میرے

نصیر ناداں کانپوری

جب آستین میں سانپوں کو پال رکھا ہے
تو کیوں تحفظ جاں کا خیال رکھا ہے

کوئی بھی تحفہ سمندر قبول کرتا نہیں
ڈبو کے مجھ کو کنارے پہ ڈال رکھا ہے

وہ دوپہر کا ہے سورج کوئی بتا دے اسے
پس عروج و بلندی زوال رکھا ہے

تلاش کیا ہے، بشر نے ازل سے جو اب تک
قدم بہشت سے باہر نکال رکھا ہے

مرے وقار کا مینار گر چکا ہوتا
اسے بزرگوں نے میرے سنبھال رکھا ہے

سفر حیات کا طے کس طرح کریں ناداں
ہر ایک ذہن میں اب یہ سوال رکھا ہے

نورین طلعت عروبہ

یہ بھی ہے ایک طرز بغاوت ہوا کے ساتھ
ہونا چراغ اور محبت ہوا کے ساتھ

تازہ گلاب حلقۂ شاخ نہال میں
جو برگ خشک ہے اسے نسبت ہوا کے ساتھ

خوشبو کی دستکوں پہ دریچے تو کھولئے
ہے اچھے موسموں کی بشارت ہوا کے ساتھ

آنچل خوشی کی اور کسی لہر میں اڑا
منسوب ہو گئی یہ شرارت ہوا کے ساتھ

تتلی کے پر پہ لکھ کے ترے نام کا پیام
کرتے ہیں گفتگو تری بابت ہوا کے ساتھ

کھولی ہوا نے پیر سے لپٹی تھکن کوئی
آئی کسی کے نام مسافت ہوا کے ساتھ

یہ کون دیپ ہے جسے رکھ کے منڈیر پر
ہونے لگی کسی کو عداوت ہوا کے ساتھ

نثار اکبر آبادی

بڑے بد نصیب تھے وہ جو بہار تک نہ پہنچے
انہیں پھول کیسے ملتے کہ جو خار تک نہ پہنچے

جو چلے تھے اپنے گھر سے بڑی آرزوئیں لے کر
وہ مسافران خستہ در یار تک نہ پہنچے

نہ وہ لوگ ڈگمگائے نہ وہ لوگ لڑکھڑائے
جنہیں ہوش تھا ذرا بھی وہ خمار تک نہ پہنچے

یونہی کھیلتے ہی گزری ہے یہ زندگی کی بازی
کبھی جیت تک نہ پہنچے کبھی ہار تک نہ پہنچے

مجھے سنگ راہ جانا مجھے ٹھوکروں سے مارا
مرے یار سنگدل تھے مرے پیار تک نہ پہنچے

مجھے چپ سمجھ رہے تھے مری گفتگو بھی سن لی
میں سلگ رہا تھا کب سے وہ شرار تک نہ پہنچے

وہ بلانا چاہتے تھے جو تھے مہربان اس کے
مگر اس کا کیا کرے وہ جو نثار تک نہ پہنچے

نوید مرزا

بلندی پر جہاں موجود ہوں میں خدایا مجھ کو اتنا پارسا کر
سر نوک سناں موجود ہوں میں مرا نقش کف پا راستہ کر

مری قیمت کا اندازہ لگاؤ تری قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے
تہہ آب رواں موجود ہوں میں ہتھیلی کی لکیروں کو پڑھا کر

مرے آنسو گواہی دے رہے ہیں مجھے تبدیل کرتا جارہا ہے
ترے دل میں کہاں موجود ہوں میں کہانی میں نیا کردار آکر

مرا چہرہ کہیں گم ہو گیا ہے جدائی کا فسانہ لکھ رہے ہو
پس گرد رواں موجود ہوں میں قدم اپنے مری جانب بڑھا کر

مجھے رستہ بدلنا آگیا ہے مجھے بے خواب کرتا رہا ہے
کہاں تھا اور کہاں موجود ہوں میں کسی کا دیکھنا پلکیں جھکا کر

جہاں ہونا مرا ممکن نہیں تھا سکوتِ مرگ میں زندہ رہا ہوں
ہمیشہ سے وہاں موجود ہوں میں مجھے اس نے کہا تھا حوصلہ کر

در و دیوار غائب ہو گئے ہیں مجھے بھی سربلندی مل گئی ہے
اکیلا ہی یہاں موجود ہوں میں درختوں کی طرح سر کو اٹھا کر

نوید مرزا

راستے میں جب کوئی جنگل گھنا پڑ جائے گا
تیری خوشبو کو وہیں پر ڈھونڈنا پڑ جائے گا

میرا سایہ تیز رو حد سے زیادہ ہوگیا
دھوپ کے صحرا میں تنہا بھاگنا پڑ جائے گا

تیری آنکھوں کے سمندر نے بلایا ہے مجھے
ان سرابوں میں کسی دن ڈوبنا پڑ جائے گا

جبر کی اونچی فصیلیں اور اونچی ہوگئیں
ابر کے لہجے میں ہم کو بولنا پڑ جائے گا

جب سلگتے خواب تعبیروں میں گم ہو جائیں گے
شہر سو جائے گا مجھ کو جاگنا پڑ جائے گا

رفتہ رفتہ منزلیں گرد سفر میں کھو گئیں
کیا ہمیں اپنی طرف ہی لوٹنا پڑ جائے گا؟

خواہشوں کو جب نئے چہرے عطا ہو جائیں گے
آنکھ سے باہر نکل کر دیکھنا پڑ جائے گا

منزل ہستی سے پہلے راستہ بھی چاہئے
کیا ہمیں اپنا بدن ہی کاٹنا پڑ جائے گا؟

بارش سنگ ملامت ہونے والی ہے نوید
جانے کتنے آئنوں کو ٹوٹنا پڑ جائے گا

حشر کی صورت بپا رہتا ہوں میں
اپنے اندر چیختا رہتا ہوں میں

اس کی تصویریں بنانے کے لئے
منظروں کو جوڑتا رہتا ہوں میں

جسم سے آزاد ہوتا ہی نہیں
اپنی مٹی میں دبا رہتا ہوں میں

مجھ کو صدیوں کا سفر درپیش ہے
رفتہ رفتہ ٹوٹتا رہتا ہوں میں

زندگی خوشبو کی صورت ہے نوید
جس کے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں میں

نعمان شوق

دن ڈھلے تو خواب کے ٹوٹے پروں پر کچھ لکھیں
جو پرانے ہو چکے ان منظروں پر کچھ لکھیں

خوف ہے ٹوٹے نہ پیلے نیلے رنگوں کا طلسم
اور یہ خواہش بھی تتلی کے پروں پر کچھ لکھیں

اب تک اس کے دل میں روشن ہوں مرا ہی وصف ہے
یہ ہنر سب میں کہاں جو پتھروں پر کچھ لکھیں

یہ سمجھ لے آنے والی نسل ہم بزدل نہ تھے
اپنے خوں سے دشمنوں کے خنجروں پر کچھ لکھیں

نیناجوگن

دوں میں کیا خط کا جواب آج کہ اس کا ہے خیال
نہ قلم ہی ہے مرے پاس نہ اچھا کاغذ

ڈھیر کا ڈھیر یہ کیوں بھیج دیا ہے مجھ کو
میں نے تو آپ سے مانگا تھا ذرا سا کاغذ

اس پہ خط لکھوں جو ان کو تو کہیں گے وہ کیا
کس جگہ سے یہ اٹھا لائے ہو میلا کاغذ

خط مجھے لکھتا ہے اک مرد ستم گر کو نینا
اس لئے میں نے منگایا ہے سنہرا کاغذ

نوید صادق

اک ستم باقی تھا سو وہ جان جاں نے کر دیا
سہل ہر تہمت کو ہم پر مہرباں نے کر دیا

راستوں کی دھول میں سب منزلیں گم ہو گئیں
دل شکستہ ہو گئے' کیا سارباں نے کر دیا

آنکھ کھولی تو کھلا کہ سارے بچے مر گئے
ماں کو حیراں خواب جنت آشیاں نے کر دیا

سانس لینا حسرتوں کی دھول میں دشوار تھا
کرب قربت کا اضافہ میری جاں نے کر دیا

آج بھی حسن و حیا کی دھوپ سے قربت رہی
آج بھی سیراب مہر آسماں نے کر دیا

چاہتوں کی فصل تو کٹنے کا موسم آگیا
پر شکستہ مجھ کو جسم ناتواں نے کر دیا

تم تو صادق شہر میں آئینہ اوصاف تھے
تم کو رسوا شہربھر میں دلبراں نے کر دیا

ملک زادہ جاوید

سبھی کے ہونٹوں پہ لوٹے گی اب خوشی کی لکیر
کہ میرے ہاتھ میں باقی ہے زندگی کی لکیر

بھٹکنے والے مسافر کو کھینچ لیتی ہے
اندھیری رات میں ہلکی سی روشنی کی لکیر

پرندے بیٹھے ہیں شاخوں پہ سر جھکائے ہوئے
چمن میں بکھری ہے ہر سمت خامشی کی لکیر

لگے ہیں ٹاٹ کے پردے ہر اک مکاں پہ یہاں
ادھر سے ہو کے گزرتی ہے مفلسی کی لکیر

اداس اداس سی آنکھیں ہیں مضمحل چہرے
ہمارے عہد سے ملتی ہے کس صدی کی لکیر

وزیر آغا

دیئے اگر وہ ترے شہر کے بجھا دیتے
ستارے ہم بھی کہیں سے تجھے منگا دیتے

بلا لیا ہمیں ہوتا اگر سمندر نے
تو ہم بھی کشتیِ جاں داؤ پر لگا دیتے

بتائیں کیا کہ اداسی تو اپنی عادت ہے
جو ہوتی دل میں کوئی بات تو بتا دیتے

فشارِ غم کا اگر دیکھنا ضروری تھا
تو میرے حصے کا غم ابر کو دلا دیتے

دیا جواب نہ تو نے تو ہم برہنہ پا
گئے، پہاڑ کی جانب، تجھے صدا دیتے

نہ حرف حرف مٹایا گیا ہمیں ورنہ
ہم اپنے مٹنے کا منظر تجھے دکھا دیتے

ہوا پہ ہوگا تجھے اعتبار ہم کو نہیں
"ہوا کو کیسے ترے شہر کا پتا دیتے"

وسیم صدیقی

اب لوگوں کے چہروں پہ بشاشت نہیں ملتی
شاکی ہوں زمانے میں محبت نہیں ملتی

وہ خوف ہے چھایا کہ کوئی سچ نہیں کہتا
قاتل کے لئے کوئی شہادت نہیں ملتی

جب کام پڑا ان سے تو معلوم ہوا یہ
ان اجلے لباسوں میں شرافت نہیں ملتی

کیا جانے کہ کس بھیس میں اب کون چھپا ہے
انساں کو بھی انساں کی حقیقت نہیں ملتی

کیوں خوف یہ چھایا ہے وسیم اپنے نگر میں
پژمردہ ہیں انسان حرارت نہیں ملتی

وحید احمد

مجبوریاں بنے گا ، بہانے بنائے گا
ہم آج کا کہیں گے وہ کل پر اٹھائے گا

اندھے نے اپنے ہاتھ پہ آنکھیں اگائی ہیں
چھونے کی دیر ہے تمہیں پہچان جائے گا

سیال سوچ اپنی ہمیشہ سفر میں ہے
اس کا بہاؤ ہی اسے رستہ دکھائے گا

شیشہ چمک رہا ہے کہ پانی ہے جھیل کا
اس پر کھلے گا پہلے جو پتھر گرائے گا

مفلوج ہو گیا جو ہوا کا بدن وحید
آندھی سے خون پھوٹ کے گردش میں آئے گا

وقار مانوی

اس سے جو گزرے، وہ ہے حوصلہ دل والا
اصل میں دور ہے یہ سخت مراحل والا

تند امواج ہیں کیا، شور تلاطم کیا ہے
اس کا اندازہ کرے کیا کوئی ساحل والا

سفر جادہ پرخار اور اک آبلہ پا
عشق چنتا ہے مگر راستہ مشکل والا

ہر نظر کو نہیں توفیق نظارہ بھی یہاں
درد دل کا بھی نہیں اہل ہر اک دل والا

ہے کوئی قیدی زنداں کہ جو آسودہ نہیں
طوق والا ہے کوئی، کوئی سلاسل والا

دور افتادہ منزل کا تو رونا ہے عبث
آج آسودہ منزل نہیں منزل والا

چاہنے پر بھی کسی کے لئے کچھ کر نہ سکا
میں کہ اک شخص تھا محدود وسائل والا

سلتے دیکھا تو نہیں چاک قبائے ہستی
بخیہ گر کوئی اسے سی دے تو جا، سلوالا

موج طوفاں سے ہم آغوش ہوئے کیا کہ وقار
ہوگیا غرق سکوں، دامن ساحل والا

واجد امیر

کھلے جو ہم پہ کبھی ہجرتوں کے دروازے
تو عہد رفتہ نے کیا کیا لگائے آوازے

کسی طرح تو تشخص بچاکے رکھنا تھا
غبار راہ کے چہروں پہ مل لئے غازے

نئے سرے سے چمن میں بہار آئی ہے
یہ تتلیاں بھی نئی ہیں گلاب بھی تازے

جنہوں نے نفرتیں بانٹی ہیں آج گھر گھر میں
یقین رکھ وہی بھگتیں گے اس کے خمیازے

بنایا تونے ہی اس کو سنبھال بھی توہی
بکھر نہ جائیں کہیں مملکت کے شیرازے

اب ایک عمر سے دستک کے واہمے بھی گئے
کہ آہٹوں سے پرے ہیں ہمارے دروازے

نجانے کتنے ہیں طوفان اپنے سینوں میں
ہمارے چہروں سے ہوتے نہیں ہیں اندازے

کوئی تو ہے جو نئے راستے دکھاتا ہے
کہاں سے آتے ہیں دل میں یہ ولولے تازے

یہاں تو ہجر کا موسم ٹھہر گیا واجد
ہوئے تمام غلط چاہتوں کے اندازے

یاسمین کنول

نہ اتنے آج ہم لاچار ہوتے
اگر ہم صاحبِ کردار ہوتے

تمنائیں سبھی بنتی حقیقت
اگر خوابوں کے ہم معمار ہوتے

ہر اک غم کو اگر ہم بانٹ لیتے
نہ غم کے اس قدر انبار ہوتے

بھنور ہوتا نہیں جو ڈوبنے کو
تو بیڑے ہر کسی کے پار ہوتے

جو غم اوروں کا ہم اپناتے رہتے
بہت سے اپنے بھی غم خوار ہوتے

وفا کو جب کبھی اعزاز ملتا
وفا کی فوج کے سالار ہوتے

کنول قسمت جو اپنا ساتھ دیتی
ہم اپنے وقت کے سردار ہوتے

یونس نشاط

جب شکستہ کشتیوں کے بادباں کھلنے لگے
ڈوبتی آنکھوں میں بحرِ بیکراں کھلنے لگے

چند لمحوں کی رفاقت بھی تھی کتنی دلفریب
چار دن کے بعد اپنے مہرباں کھلنے لگے

شکر ہے مجھ جیسے واماندہ مسافر کے لئے
تیرے دروازے بھی شہرِ بدگماں کھلنے لگے

یہ زمیں بھی تنگ تھی جب تک رہا میں زیرِ دام
کھل گئے شہپر تو مجھ پر آسماں کھلنے لگے

گھر سے نکلیں سر بکف حرفِ صداقت کے امیں
کون جانے کب، کہاں، کس کی زباں کھلنے لگے

پھر تری یادوں نے دل کے زخم تازہ کر دیے
جب مکیں لوٹے تو بستی کے مکاں کھلنے لگے

اپنی قسمت کا ستارہ ہم کو لے ڈوبا نشاط!
ذہن پر جس دم رموزِ کہکشاں کھلنے لگے

حصّہ نظم

احمد صغیر صدیقی

نئے دنوں کی پرانی یادیں

موسم تھا آسانی
اشجار اور چھتوں پر
ٹھہرا ہوا تھا پانی
دروازے اور دواریں
گلہارے رہگزاریں
سب کا تھا رنگ دھانی

تازہ ہوا چلی تو
سوچوں کے روزنوں سے
آئیں نئے دنوں کی
یادیں بہت پرانی

بشارت

یوں سرسری نہ گزرو
اس نیند کی فضا سے
آنکھیں ابھی نہ کھولو
واشوق منتظر پر
اک باب اور ہوگا
اس خواب کے ادھر بھی
اک خواب اور ہوگا

RE-ACTION

جب بھی کھلا
وحشت کا در
جب بھی بڑھا
اندر کا ڈر
کاٹ دیئے
پھولوں کے سر
نوچ دیئے
تتلی کے پر

ہم خبر

باہر شور بلا کا ہے
چیخیں
کوئی سنے تو کیسے
ہر دروازہ بند پڑا ہے
بس اک میں ہوں
جس کو پتا ہے
کوئی اندر پھنسا ہوا ہے

اختر ضیائی

ہوا کہہ رہی ہے

عجب دشت کونین کی رہ گزر ہے
کہ جس میں
ہوا کے لئے زندگی
اک مسلسل سفر ہے
اسے ہر طرف
ساحلوں اور جزیروں کی آبادیوں
بے کراں وادیوں
پربتوں جنگلوں بستیوں
کے شب و روز کی
سب خبر ہے

وہ پت جھڑ میں
سفاک صرصر کی یورش سے
جھلسے چناروں پریشان پھولوں
پر اسرار کانٹوں کی زد میں چھپی
پر بریدہ حزیں فاختاؤں
کے اجڑے گھروں کے لئے
نوحہ گر ہے!

ہوا کہہ رہی ہے
کہ اب کے برس
شہر مایوس کی ہر ڈگر پر خطر ہے

حصار ملامت میں
پل کر جواں ہونے والے پرندوں کا
عہد زیاں بے بصر ہے
دلوں میں کدورت
سکوت اجل بن گئی ہے
کسی صوت و آہنگ میں
کیف اور رنگ کا
شائبہ تک نہیں ہے
محبت کا کچھ پاس
حسرت زدہ آرزوؤں کا احساس
ناپید ہے بے یقیں ہے
مگر اس کے باوصف
گزرے دنوں کے ہرے موسموں کی لگن
اک متاع حسیں ہے
کہ جس کے لئے ہر نظر منتظر ہے

اے خستگان دیار وفا غور سے
جو ہوا کہہ رہی ہے
ہوا وقت کے کارزاروں کی
بھٹکی بہاروں کی
پیغام بر ہے
ہوا معتبر ہے!

اسرار زیدی

اک لمحہ آزاد

کتنے خواب دیکھے تھے
کتنے خواب دیکھیں گے
اور ان کی تعبیریں
بے حساب دیکھیں گے
ان گنت سرابوں سے
بے جہت خرابوں سے
جسم و جاں گزر آئے
کارواں گزر آئے
ہر کڑی مسافت سے
بے تکاں گزر آئے
پھر بہار کا موسم
یاد یار کا موسم
جبر کے دھندلکوں میں
اختیار کا موسم
اعتماد کی گھڑیاں
اعتبار کا موسم
کتنے خواب دیکھے تھے
کتنے خواب دیکھیں گے
اور ان کی تعبیریں
بے حساب دیکھیں گے

اسلم راحیل میرزا

اذن بیداری

شب کے پورے ہو چکے ہیں انتظار!
کھول دو اب زندگی کے سب مزار!

چاندنی میں آچکا ہے اضمحال
اور ہیں خاموش تارے شرمسار

سب کی گردن خم، جبیں عرق ریز
جھک پڑے ہیں ان کے قطرے خاک پر

دور مشرق کی اندھیری دیگ میں
اٹھ رہا ہے ایک ہلکا سا ابھار

دھیرے دھیرے اٹھ رہی ہیں شورشیں
چپکے چپکے بڑھ رہا ہے انتشار

لو وہ مغرب کی فضائیں چیخ اٹھیں
وقت کی خاموش نبضوں میں شرار

نیند کی بے تار لہریں کٹ گئیں
جاگ اٹھے آخرش خوابوں کے ہار

چھا گیا ارض و سما پر انقلاب
اور دنیا بڑھ رہی ہے سوئے دار

شب کے پورے ہو چکے ہیں انتظار!
کھول دو اب زندگی کے سب مزار!

اسلم کولسری

ایکسرے

یہاں اک گاؤں ہے
جس گاؤں میں کوئی نہیں رہتا
فقط کچھ پیڑ ہیں
پیڑوں سے پتے جھڑتے رہتے ہیں
ہوائیں تیز چلتی ہیں
تو یہ سوکھے ہوئے پتے
کھلی سڑکوں پہ
خالی انگنوں میں پھیل جاتے ہیں
جہاں چولہے تو ٹھنڈے ہیں
مگر ان سے ہر اک لمحہ
دھواں سا اٹھتا رہتا ہے
مکاں خالی ہیں
لیکن کچھ صدائیں آتی رہتی ہیں
بجز اس کے
مرے سینے کے جلتے ایکسرے میں کچھ نہیں آتا

ڈاکٹر اشرف عدیل

غالب

ترے وجود سے شعر و سخن کی رعنائی
جمال حرف و معانی تری نظر میں ہے
ترے خیال کی مستی میں زندگی رقصاں
ترا کمال زمانے کے بال و پر میں ہے
ترے بیاں میں معانی طلسم کی صورت
ترے ہی حرف کی گرمی دل ہنر میں ہے
تجھے جنوں کے تقاضے تمام ازبر تھے
ترے ہی فیض سے سودا مرے بھی سر میں ہے
تری نگہ کے اثر سے گلاب کھلتے ہیں
ترے خیال کا شعلہ رخ سحر میں ہے
جو تو کہے تو یہ راز وجود کھل جائے
کلید حسن و محبت ترے ہی گھر میں ہے
ترے قلم کے تحرک سے گرمیاں فن کی
صریر خامہ غالب ابھی سفر میں ہے

اطہر عظیم

خدا توفیق دے مجھ کو

خدا توفیق دے مجھ کو
کہ میں ڈھلتی ہوئی اس شام کو تسخیر کر جاؤں
کہ میں یہ رات کا صحرا برہنہ پاؤں طے کر لوں
سحر دیکھوں
سحر کے روشن و تابندہ ماتھے پر
میں اپنا نام لکھ جاؤں
اور اس کے بعد جب خورشید آب و تاب سے چمکے
تو اس کا ذرہ ذرہ میری محنت کی گواہی دے
خدا توفیق دے مجھ کو
کہ میں اونچا بہت اونچا بہت اونچا چلا جاؤں
مہ و اختر مجھے قدموں تلے ذرے نظر آئیں
بصیرت مجھ کو مل جائے
حقیقت مجھ پہ کھل جائے
حیات جاودانی کے لئے میں جسم کا تحفہ
صلیب و دار کو دے دوں
خدا توفیق دے مجھ کو
کہ میں بادل کی صورت قریہ قریہ کوبہ کو جاؤں
میں اپنا خوں پسینہ نذر کر دوں اپنی اس زرخیز مٹی کو
شہادت کا علم ہاتھوں میں ہو چہرے پہ مسکانیں
مجھے گمنام فوجی کی طرح کوئی نہ پہچانے
فقط میرا خدا جانے
خدا توفیق دے مجھ کو

آغا محمد سعید

افریقہ

وہ ہیبت ناک جن صدیوں سے جو سویا پڑا تھا
اس ہیبت ناک جن نے اک ذرا کروٹ سی اب لی ہے
مہذب دیوتاؤں کے جہاں میں زلزلہ سا آگیا ہے
کبھی اس دیو ہیکل نے جو آنکھیں کھول دیں اپنی
اور اپنے جسم کی اس آہنی زنجیر کو دیکھا
جو اس کے ہاتھ پاؤں میں
مہذب دیوتاؤں نے ہے پہنائی
کہ اس تہذیب کے بدلے میں وہ اس کو غلامی کے
گڑھے میں حشر تک زنجیر پار کھیں
مگر وہ دیو ہیکل اب جو جاگا ہے
تو یہ لوہے کے زنجیر و سلاسل توڑ ڈالے گا
غلامی کا لبادہ بھی بدن سے پھاڑ ڈالے گا
جو پہنایا ہے اس کو ان مہذب دیوتاؤں نے
تو یہ سوچو کہ اس تہذیب کا پھر حشر کیا ہوگا
کہ جس کے نام پر اب تک وہ زنجیروں میں جکڑا ہے
مہذب دیوتا سوچیں ذرا سی بات کو آخر
مہذب دیوتاؤں کے تدبر کا یہ لمحہ ہے

اظہار شاہیں

ادھ کھلا در

پتے، غنچے اور ہوا
سب کی آدھی آدھی بات
سب کا آدھا آدھا دن
سب کی آدھی آدھی رات

صحرا، دریا اور گھٹا
سب کے آدھے آدھے بول
سب کی آدھی آدھی مانگ
سب کے آدھے آدھے خول

رستے، رہرو اور غبار
سب کی اپنی اپنی چال
سب کے آدھے آدھے پیر
سب کے آدھے ماہ و سال

گلیاں، کوچے اور بازار
سب کے آدھے آدھے رنگ
سب کی آدھی آدھی خو
سب کی آدھی آدھی جنگ

آنکھیں، چہرے اور دماغ
سب کے آدھے آدھے روگ
سب کے آدھے آدھے کھیل
بستی بستی آدھے لوگ

شام

کون جاتا ہے ایسے کسی شہر سے
جیسے رستہ کوئی
جیسے جھونکا کوئی
جیسے موسم کوئی
بے خبر بے خبر
بے صدا بے صدا
ڈالیوں کی طرح
سر جھکائے ہوئے
ساحلوں کی طرح
زخم کھائے ہوئے
جیسے اس کو کبھی لوٹ آنا نہیں

اعجاز احمد ثاقب

ہواکے سبھی بین سچ ہو گئے

میں اندھے نگر میں
اجالوں کی بیساکھیوں پر ہی
خود کو گھسیٹے لئے جا رہا تھا
کہاں جا رہا تھا؟
اداسی کے لب پر
ہوا چیختی بین کرتی ہوئی کس لئے آ گئی تھی
ابھی وقت نے
میری بیوہ نگاہوں سے اتنا کہا تھا
کہ تم اب سہاگن ہو
اور......................
وقت کی نقرئی ننگی بانہیں فضا میں اٹھیں
وقت پھر رک گیا
وقت کی چیخ تک میں نہیں سن سکا
وقت پھر مر گیا
ہوا کے سبھی بین سچ ہو گئے۔

افتخار شفیع

پلٹ کے دیکھو

(زینۂ دل پر لحظہ لحظہ اترتی ایک شام کی نذر)

پلٹ کے دیکھو
گئی رتوں کے عجب مسافر
پلٹ کے دیکھو
فراخ راتوں میں رتجگوں سے
بھری نگاہوں میں کچھ تو جھانکو
ذرا تو سوچو، غم والم کے عجیب منظر
جو تیری آمد کے پیش رو ہیں
ہیں جگ میں پھیلی کدورتوں کی نشانیاں بھی
انہی مناظر کی طرح دل میں اترنے والا
ورق ورق پر ہر رنگ خوشبو بکھرنے والا
تمہاری خاطر نجانے کب سے
ادھوری شکلوں میں ڈھل گیا ہے

اعجاز رضوی

ہوا کی حمایت میں

ہوا نے کیا بنایا کیا مٹایا ہے
یہی وہ بات ہے جو بہتا دریا اپنے ساحل پر کھڑے
پیڑوں سے اکثر پوچھتا رہتا ہے
دریا بے خبر ہے اس کی بانسوں میں ہمکتی موج کہتی ہے
سبھی کچھ تو ہوا کا ہے
مگر دریا ہمکتی موج کی باتوں سے بے پرواہ
کسی بے راہرو شہزادے کی صورت
خس و خاشاک سے لڑتا
بلند آواز میں یہ کہتا جاتا ہے
ہوا نے کیا بنایا کیا مٹایا ہے؟
ہوا نے کیا گھٹایا کیا بڑھایا ہے؟
ہوا خاموش ہے دریا کے دعوے پر
مگر اس کی حمایت سے کھڑے پیڑوں کی خاموشی
دلوں میں ڈر جگاتی ہے

ہم ٹھہرے نادان

دھاگا جوڑا چرخا کاتا
پھر خود ہی اپنی محنت کو آگ لگا دی'
دودھ بلویا مکھن پایا
پھر خود ہی مکھن کو چھت پر پھینک دیا
دانے بوئے فصل اگائی
پھر خود ہی اس کھیت میں گھوڑے چھوڑ دیئے
مٹی کھودی پانی پایا
پھر خود ہی پانی میں زہر ملا بیٹھے
آنکھیں موندھی سپنا دیکھا
پھر خود ہی سپنے سے ڈر کر جاگ گئے
ہوش سنبھالا کمرہ دیکھا
پھر خود ہی کو گالی دے کر لیٹ گئے

المیہ

ایک میں ہی نہیں شہر میں
اور بھی میرے جیسے ہزاروں ہی سر
اپنے تن سے جدا
صرف آنکھوں کے بل چل رہے ہیں
کہ میں ہی نہیں شہر میں
اور بھی میرے جیسے ہزاروں بدن
خاک کا جوا اپنے
کوئی اعلیٰ خوشبو لگائے
کسی دوسرے سے بہت خوف کھائے
فقط اپنی آنکھوں کے بل چل رہے ہیں

اصغر شاہیا

امید

کبھی لو دیتی ہے آنکھوں میں بشارت کی گھڑی
گھیر لیتی ہے کبھی گہری اداسی دل کو
آس بندھ جائے کبھی میری وفور غم میں
کبھی لٹ جائے متاع امید
زندگی اک شب تیرہ کی طرح ہے جس میں
وقفے وقفے سے سحر تک پیہم
ایک جگنو کی طرح
کبھی جلتی کبھی بجھتی ہے شعاع امید

اقبال ناظر

میرے دریاؤں سے کہہ دو

مری امید کا سورج
ابھی اس اور رہتا ہے
مجھے سورج کو لانا ہے
مجھے اس اور جانا ہے
مرے دریاؤں سے کہہ دو
مرا نہ راستہ روکیں
وگرنہ میں سمندر ہوں
میں دریا پی بھی سکتا ہوں
اگر پایاب ہوں دریا
تو تشنہ جی بھی سکتا ہوں

اکبر حمیدی

میں تم کو یاد آؤں گا

یہ موسم جونہی بدلے گا
نئے سورج کی کرنیں جب فضا کو گدگدائیں گی
شگوفے مسکرائیں گے
چناروں کے بدن پر سرخ پھولوں کی قبا ہوگی
گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں گی
جل تھل ایک کردیں گی
زمیں کے ذرے ذرے میں
تمہارے تن کی خوشبو پھیل جائے گی
پرانے خواب کی دنیا نئی تعبیر پائے گی
میں تم کو یاد آؤں گا
جو کہتا تھا یہ موسم جانے والا ہے
جب اس کا کوئی بھی امکاں نہیں تھا

اوٹ

ہوائیں چلتی رہتی ہیں
ہواؤں سے نہ گھبرانا
مگر جب ایسا موسم ہو
بڑے ضبط و تحمل سے
زمیں میں اپنے پنجے گاڑ دینا
اور اپنی اوٹ ہو جانا

امجد علی شاکر

منسوخ عہد نامہ

میں کہ اک عہد نامے کی مانند لکھا گیا
اور ٹانکا گیا
ایک دیوار پر
مجھ پہ لکھے حرف
وقت کی تیز مکڑی کا کھاجا ہوئے
اور میں
بے زباں بے نشاں
ایک کورا سا کاغذ ہوا
ایک حیرت لئے
اور یہ دیکھ کر
اک نرالا تحیر ہوا
لوگ اب بھی وہی
میرے ماتھے پہ لکھی، عبارت پڑھیں

انوار فیروز

خزاں کے بعد

پھر خزاں آگئی
برف گرنے لگی چار سو
پتے پتے کو ڈھانپا سفیدی نے یوں
جیسے افسردگی جیسے واماندگی
گھیر لیتی ہے ہر اک کو وقت سفر
(جبکہ ہو رات گہری بھی تاریک بھی)
چھپ گئے برف میں پھول رنگین سب
باد صرصر تھپیڑے لگانے لگی
اور خزاں مسکرانے لگی
گویا قائم رہے گی ابد تک وہی
دھوپ پھیلی پہاڑوں پہ
اور رات کے
سوئے پنچھی اٹھے' اٹھ کے اڑنے لگے
دھوپ نکلی تو پھول سے لپٹی ہوئی
برف شبنم بنی
پھول چنکے فضا میں اچھلنے لگے
اور خزاں کا فسوں یوں بکھرنے لگا
جیسے لوٹا ہوا قافلہ
دشت غربت میں ہو سوئے منزل رواں

خوشی کے لمحے

خوشی کے لمحے
جنہیں خواہشوں نے میری
کبھی خواب میں بنا تھا
جنہیں سمندر کی تند لہروں پہ لکھ دیا تھا
ہماری ہستی کی ساعتوں میں
وہ ایک آہٹ ساعتوں میں
مچل رہی ہے سنبھل رہی ہے
مگر کہاں ہیں وہ خواب میرے
سوال اس کے جواب میرے
انہیں کو اب تک میں ڈھونڈتا ہوں
وہ لمحے آخر کدھر گئے ہیں
یہ خواب میرے بکھر گئے ہیں
چڑھے تھے دریا محبتوں کے
تمام اب تو اتر گئے ہیں
انہیں کو اب تک میں ڈھونڈتا ہوں
خوشی کے لمحے
جو مل کے مجھ سے
بچھڑ گئے ہیں

انیس انصاری

معتبر مورخ

شب بیدار ارادوں کے پہیے تلے
جب وہ میری روح کو کچلتی ہے
میری روح ششدر رہ جاتی ہے
میری روح فقیر کے چیتھڑوں کی طرح
میرے جس پر لٹکنے لگتی ہے
اس وقت میں اس قدر اذیت میں ہوتا ہوں
اپنے دکھ میں اس قدر ڈوبا ہوتا ہوں
کہ پہلی رات میں کام کرنے والی
اس جلاد پر نشترزنی نہیں کرپاتا
جو مجھے اذیت پہنچاتی ہے
روحانی تکلیف اور دکھوں کا غبار
میری آنکھوں اور چہرے پر پھیل جاتا ہے
ورنہ میں اپنی اذیتوں کا کتنا معتبر مورخ ثابت ہوتا
یہ بھی صحیح ہے کہ
مجھے اذیت پہنچانے والی
اپنی حقیقی زندگی کی تفصیلات
کبھی بھی ظاہر نہیں کرے گی
پھر بھی ہر سابق قیدی کے ذہن میں
اس پر کیا جانے والا جبر
محفوظ رہتا ہے
میں بھی کبھی نہیں بھول پاتا
کہ اس نے مجھے کس بے دردی سے کچلا اور
کس طرح اپنے غلط شکنجے میں کس کر
مجھے لہولہان کردیا
اس جلاد کے بارے میں
بطور انسان کچھ سوچنا تو دور کی بات ہے
میں اس کا نام بھی بھول جانا چاہتا ہوں
اور سوچتا ہوں
کہ صرف ایک بار
فقط ایک بار
ایک معتبر مورخ بن جاؤں

اوپندر ناتھ اشک

تجسس

اس کے آنے کا خوف تو نہیں دل میں
صرف تجسس ہے
وہ کیسے آئے گی؟
اطلاع دے گی
کال بیل بجائے گی
ہاتھ ملائے گی
بازوؤں میں بھینچ لے گی اس طرح
کہ جھنجھوڑ دے گی، توڑ دے گی انگ انگ
یا آنکھوں سے آنکھ ملائے گی اور
لے جائے گی اپنے سنگ
یا بیٹھ جائے گی آکر سامنے
اور سرکے گی آہستہ آہستہ میری طرف
کانوں میں گونجے گا اس کے خاموش سرکنے کا شور
یا ایک ہی جھٹکے سے کاٹ دے گی
اتنے دنوں سے تنی یہ زندگی کی ڈور
یا آئے گی اور پتہ بھی نہیں چلے گا
کہ بڑھا تھا اس کا غیر مرئی ہاتھ
صرف قریبی رشتہ دار اور دوست احباب جانیں گے
وہ آئی تھی اور لے گئی ہے اپنے ساتھ
اس کی آمد کے پچاسوں ڈھنگ ہیں
دل میں خوف نہیں تجسس ہے محض
میرے سلسلے میں کونسا اپنائے گی
جب آئے گی

پھانس

نہ جانے یہ پھانس کب لگی تھی
کس انجانے لمحے
جب میں چوک گیا
یا تم!
میں سمجھتا تھا
(شاید تم نے بھی یہی سمجھا تھا)
پھانس نکل گئی ہے
لیکن شاید یہ ٹوٹ گئی تھی۔ تمہاری انگلی
اور انگوٹھے کے ناخنوں سے۔ اور کبھی جب اچانک
ٹیس اٹھتی۔ میں کہتا (تم بھی کہتیں)
چبھن ہے۔ اور ہم
دوسری دوسری باتیں کرنے لگتے
لیکن نہیں۔ تم نہیں جانتیں
(نہ میں ہی جانتا تھا) یہ پھانس
لگاتار گڑتی چلی گئی ہے
اور کہیں بہت گہرے میں جاکر رک گئی ہے
کہ پتلی سے پتلی سوئی لے کر
لاکھ کریدو۔ کچھ پتہ نہیں چلتا
صرف رات کے تنہا لمحوں میں
ایک درد ہے۔ جو ہمیشہ ٹیستا رہتا ہے

اوپندر ناتھ اشک

موت کو کشتی بنا کر.....

موت کو کشتی بنا کر دوستو
میں اترا ہوں زندگی کے بحرِ زخار میں
بے جھجک' بے خوف' بے خطرا
جھیلے ہیں آندھی طوفان
اور سفاک مذاق اس ستم ظریف کے
بے انداز کھلنڈرا پن' ناگہانی حادثے
ان' جانی مصیبتیں
جھیل گیا ہوں ہنستے ہنستے مستی اس من موجی کی
پار کر گیا ہوں دیواروں ایسی لہریں
اس بحر ناپیدا کنار کی
موت کی کشتی میں بیٹھا ہوا
اس کے ہر رنگ اور روپ مزاج کا مزا لیا ہے
زندگی کو ہمک کر جیا ہے
مجھے مل گیا تھا تعارف موت کا دھر بچپن میں
محض چہرہ دیکھا تھا' اس ظالم کا
پہچانا اسے جوانی میں
جانا کچھ عمر رسیدہ ہو کر
کس طرح اس کے بڑھتے سایے
سکھا دیتے ہیں ساری ہریالی اس جسم کی
گول گلگو تھنے گلابی گال' ہڈیاں بن جاتے ہیں
رہ جاتے ہیں صرف دانت
لرزا دیتی ہے من کی ہنسی
ریڑھ کی ہڈی کو اوپر سے نیچے تک
ڈھے جاتی ہے دیمہ جیسے دیوار
پہاڑ سے سینے پڑ میں دوز ہو جاتے ہیں
تبھی میں نے لے لیا تھا اسے اپنے ساتھ
تریری کی طرح
اور اتر گیا تھا جوار پر آتے' سمندر میں زندگی کے
ہمک کر جیا ہوں' احساس کی پوری شدت سے
مرنا سہل ہے دوستو!
ختم ہو جاتے ہیں لوگ
گلی بازار' دوراہے چوراہے' گاڑی یا بس میں
جیتے بھی نہیں' مرتے جیتے ہیں بار بار
محض گھسٹتے رہیں' چپلی یا راہیں
بے ذائقہ گھڑیاں
دبی ہوئی آہیں
ان کے دل کا درد کہتی ہیں
موت سہل ہے دوستو' جینا کٹھن ہے
جو موت کو نہیں جانتے ہمک کر نہیں جیتے

اوپندر ناتھ اشک

موت برحق ہے دوستو

موت برحق ہے دوستو!
یہی سوچ کر میں نے جیا ہے زندگی کا ہر لمحہ
اپنی دلی مسرت کے لئے
بہت بھاگ دوڑ کی۔ بے پناہ سنگھرش کیا
لیکن نہیں کی خوشامد۔ نہ کئے سمجھوتے اپنے اصولوں کے
اپنے آدرشوں سے نہیں گرا۔ نہ ہوا طالب رحم
زندگی کو سمجھا ہے جیب میں پڑے استعفے کی طرح
اور حکم بجایا ہے اس کا' سر اٹھا کر
اپنے کام کی ہر ساعت کا پورا لطف اٹھایا ہے
دوستو! مجھے نہیں چاہئے جھوٹی دولت' شہرت یا عظمت
کھوٹے سکے' تخت و تاج پر جڑے جائیں' کھوٹے ہی
رہیں گے
بٹوریں انہیں شوق سے راجدھانیوں کے وہ ساتھی
منظور ہے جنہیں
دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنا
اپنا چہرہ' نام' رتبہ
شوق بصد مشغول رہیں
دن رات نفسانفسی میں
دریا کے سنسان کنارے پر مزے سے تیرتی مرغابی کی
طرح
مجھے اس شہر ریاضت کا سکون پسند ہے
پسند ہے دیانت کا کھرا سکہ
اپنی آنکھوں کی تحسین
اپنے دل کا اطمینان
موت برحق ہے دوستو' اسے آئے.......

بیٹے یہ میرا پیشہ نہیں

میرا سب سے چھوٹا پوتا
اچانک بھاگا آیا
ہاتھ میں میرا کھلا ہوا ناول
آنکھیں پھیلی پھیلی سی
اور مسکراتے ہونٹ مجھے کہنے کو بے تاب
میں نے سر اٹھایا
"پاپا آپ نے بہت اچھا پروفیشن چنا ہے"
"پروفیشن"
میں ہنسا
"بیٹے یہ میرا پیشہ نہیں
میری زندگی ہے"

اوپندر ناتھ اشک

زندگی ایک مقدس شے ہے

"زندگی ایک مقدس شے ہے"
ایک نہایت کامیاب ادیب نے۔
اپنے نئے شاگرد سے کہا
اور غذا بھی مقدس ہے
کہ وہ زندگی کو قوت بخشتی ہے"
لیکن کب ہو جاتی ہے بد تر۔
زندگی موت سے
اور غذا زہر سے
اسے صرف حساس لوگ ہی جانتے ہیں

جب میں نہیں رہوں گی

"جب میں نہیں رہوں گی"
اچانک ایک دن میری بیوی نے کہا
تبھی جانو گے میری خوبیاں
"تم بھی" میں نے جواب دیا
جو کبھی ان کی طرف دھیان نہیں دیتی
اور جو ہمیشہ شکایتیں کیا کرتی ہو"

بختیار احمد

یہ رات

یہ رات ابھی تو مہکی نہیں
یہ رات ابھی تو بہکی نہیں
یہ رات ابھی تو کچی ہے
یہ رات بہت ہی کچی ہے
یہ رات ابھی نوخیز سی ہے
یہ رات ملاپوں والی ہے
یہ رات گلابوں والی ہے
یہ رات شرابوں والی ہے
یہ رات سہاگوں والی ہے
یہ رات عذابوں والی ہے
یہ رات گئی تو بات گئی
یہ رات گئی تو خواب ہوئی
یہ رات چلے جیون بھر تو
یہ رات جلے جیون بھر تو
یہ رات کہاں پھر آئے گی
یہ رات بہت یاد آئے گی
یہ رات بہت تڑپائے گی

تعبیر

پھر ایک آہٹ
پھر ایک دستک
دل ناصبور بے قرار نہ ہو
یہ ایک آہٹ یہ ایک دستک
ان ہزاروں آہٹوں اور دستکوں کا خواب ہے
جس کی تعبیر ہر اک بار
ہوا کا ایک سرد جھونکا

بادصبا

دریچے وا ہیں اور بادصبا کو
نہیں فرصت کہ گذرے رہ گزر سے
کہ غنچے کو کھلا دے
کہ دل کو گل بنا دے

نخشب لائلپوری

آواز

پرانے لفظ تفہیم معانی سے ہوئے عاجز
سخن کو اک نیا انداز دیکر دیکھ لیتے ہیں

یہ مانا بند ہیں سارے دریچے آسمانوں کے
صدا کو رفعت پرواز دیکر دیکھ لیتے ہیں

خرد نے جبکہ مضراب محبت توڑ ڈالا ہے
جنوں کے ہاتھوں میں یہ ساز دے کر دیکھ لیتے ہیں

یہ گونگے لب جو گویائی کی حسرت میں تڑپتے ہیں
تکلم کا انہیں اعجاز دیکر دیکھ لیتے ہیں

کوئی شاید خدا کے روپ میں انسان مل جائے
حرج کیا ہے چلو آواز دیکر دیکھ لیتے ہیں

بشریٰ اعجاز

شناسا آگ خوابوں کی

شناسائیوں کی جلن پھانک کر
وصل کی پیاس میں نیم جاں
جلتے سورج کے نیچے کھڑی
کس شجر کی تمنا میں
آنکھوں میں اب تک
بچائے ہیں تو نے
وہ معصوم سپنے
جو بے چین سینوں کا
ارمان تھے
بانوری جا
جلادے وہ سپنے
شناسائیوں کے الاؤ میں
رکھ دے انہیں
اور خود ہجر کی
سرد برفیلی چادر سے
تن ڈھانپ لے
تو بھی
صدیوں سے جاگی ہوئی روح کو
تھوڑا آرام دے

میں ارزاں جنس ہوں لیکن

مری آنکھیں منور ہیں
مرا سینہ دعائے بے ثمر کے
درد میں جلتا ہے
ہفت افلاک میری نیند کے بستر پہ سوتے ہیں
میرا دل کائناتی بوجھ سے لبریز رہتا ہے
میں اپنی سانس کے نم سے
جھلستی ریت کے سینے سے
سکھ کونپل اگاتی ہوں
نئے موسم کی شادابی لٹاتی ہوں
مری شاداب چھاؤں میں
مسافر آکے رکتے ہیں
میں ارزاں جنس ہوں لیکن
گرانی میرے آنچل کی
گرہ میں ہے ----!!

بشیر رحمانی

اعتراف

میں بھٹکتا رہا ہوں مدت سے
زندگی کے سلگتے صحرا میں
جیسے آوارہ سا بگولہ ہو
گھر کی راہوں کو کوئی بھولا ہو
میرا دل ہاؤ ہو کی لہروں میں
مجھ کو بھی ساتھ لے کے بہتا رہا
میں مسافر ہوا اندھیروں کا
گمرہی بن گئی مری تقدیر
اور گناہوں کے کالے ناگوں کو
خواہشوں کی پٹاریوں میں لئے
اپنی رگ رگ میں زہر بھرتا رہا
بدنمائی مرے گناہوں کی
میری فرد عمل کے چہرے پر
ثبت کرتی رہی سیاہ دھبے
آج اے رب ذوالجلال و کریم
تیرے در پر جھکا کے سر اپنا
اعتراف گناہ کرتا ہوں
مجھ خطاکار کی خطاؤں کو
درگزر کر مری سزاؤں کو
اپنی رحمت سے اے رحیم و کریم
نور عرفان و آگہی دیدے
مجھ کو توفیق بندگی دیدے
تیرگی کے غبار کو دھو دے
میرے سینے میں روشنی بو دے

بیدل حیدری

مجھے اک گیت لکھنا ہے

مجھے اک گیت لکھنا ہے 'اور ایسا گیت لکھنا ہے
کسی نے آج تک لکھا نہیں جس کو
کسی نے آج تک گایا نہیں جس کو
مجھے اک گیت لکھنا ہے
اسی دھرتی کے دل کا گیت لکھنا ہے
اور اس میں اپنے دل کی دھڑکنیں بھی مجھ کو لکھنی ہیں
مجھے اک گیت لکھنا ہے
دلوں کی زود اثر جادو گری کا گیت لکھنا ہے
کہ تسخیر دو عالم ہو عروج ابن آدم ہو
مجھے اک گیت لکھنا ہے
بنام امن لکھنا ہے
اور اس کی فاختہ دھن بھی مجھے خود ہی بنانی ہے
یہی اب دل میں ٹھانی ہے
مجھے اک گیت لکھنا ہے
مقدس گیت لکھنا ہے
مجھے ماں کے لئے اک گیت لکھنا ہے
کہ جس نے دہر میں پیدا کیا
پیغمبروں' دانشوروں اور سورماؤں کو
مجھے یہ گیت بیدل اس لئے لکھنا ہے اور سب کو سنانا ہے
کہ مجھ کو میری ماں نے اور خدا نے
صرف اسی مقصد کی خاطر زندگی دی ہے

بینا گوئندی

مٹی

سرما کی اس شام کا منظر
دل کے اندر گہری یادیں
آنکھوں میں تصویر کسی کی
میرے ساتھ سفر میں گم تھے
اجلے اجلے تھے سب رستے
آگے پیچھے چلتے میرے
اس وادی میں پھیل رہے تھے
تیری یاد کا روشن سایا
چلتے چلتے پاس تھا آیا
مجھ کو کچھ احساس نہیں تھا
جیسے کوئی پاس نہیں تھا
میں جیسے پتھر جیسی تھی
شاید میں ساکن مٹی تھی

تبسم کاشمیری

لڑکی اور ستارہ

چاند کی انگلیاں، سورج کی آنکھیں
تارہ کبھی سبز ہوتا تھا اور کبھی سرخ
کبھی زرد اور کبھی سفید ا
لڑکی نے پوچھا
تارے ا تم رنگ کیوں بدلتے ہو؟
"لڑکی ا میری آنکھ میں جھیل جتنا پانی ہے
اور میری پیشانی پر ایک ہزار ایک جنگل ہیں"
تارے تم کتنے دکھی ہو
تارہ یک دم زرد ہو جاتا ہے
لڑکی جلدی جلدی پہاڑی پھولوں سے
ٹوکریاں بھرتی ہے
تارے ا تم زمین پر آجاؤ
تارہ آہستہ سے ہنستا ہے
میں تمہیں حروف تہجی سکھاؤں گی
تارہ سر ہلاتا ہے
ہم تم ساتھ ساتھ پھول توڑیں گے
تارہ آہستہ سے آنکھ جھپکتا ہے
ہم تم ساتھ ساتھ رہیں گے
تارے کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ہے
اور جھیل جتنا پانی
لڑکی کے ملبوس پر گرتا ہے
اور ایک جنگل
اس کی ٹوکری میں اگنے لگتا ہے
چاند کی انگلیاں، سورج کی آنکھیں
اور آسمان کا نیلا جنگل ا

تبسم کاشمیری

ایک ملاح کے دل کے اندر

لڑکی! رات کی پسلیاں برف سے منجمد ہو گئیں ہیں
رستے کی آنکھیں برف سے مکحول ہو چکی ہیں
تم کہاں سے آ رہی ہو؟
اک ملاح کے دل کے اندر!
لڑکی رک جاؤ! تمہارے پاس گھوڑا ہے نہ زادِ راہ
نہ خیمہ، نہ ملبوس، نہ رستہ دکھانے والا تارہ
اور نہ قافلے کی کوئی گھنٹی
لڑکی رک جاؤ!
میں تمہیں گرم لباس، گرم مشروب
اور گرم غذا کا توشہ دیتا ہوں
سفر کے لئے ایک ناؤ، دل بہلانے کے لئے ایک داستان
اور کچھ زادِ رہ لیتی جاؤ!
بس ذرا دھوپ کا پہلا پھول کھلنے
اور رنگ کا پہلا بیج پھوٹنے تک
انتظار کرو!
لڑکی! تم اس بھیانک کالی رات میں کہاں جا رہی ہو؟
"اک ملاح کے دل کے اندر!"

تحسین فراقی

امت مظلمہ

ہاتھوں پہ چٹیں لگی ہوئی ہیں
ہاتھوں میں کاسۂ گدا ہے

حلقوم برادراں پہ خنجر
اور لشکر دشمناں میں جا ہے

عبرت کشو! نگاہ کرنا
یہ امت شاہ دوسرا ﷺ ہے

جاوید شاہین

ہمیں کون بتائے گا

اب جب کہ موسم گرما
بارشوں کی شدت سے ہلاک ہو چکا ہے
اور بادلوں کے شکستہ جہاز
آسمان کے نیل میں ڈوب چکے ہیں
ہم اپنے دروازوں پر خزاں کی دستک
سن رہے ہیں
اور سوچ رہے ہیں
کہ اس کا استقبال کن لفظوں میں کریں
ہمارے لفظوں پر خاموشی جم چکی ہے
وہ یکسانیت کے مرض میں مبتلا ہیں
اور بے دریغ استعمال سے ناکارہ ہو چکے ہیں
ہم رنگ بدلتی دھوپ سے کیا کہیں
ہلکی خنک ہوا کا شکریہ کیسے ادا کریں
گرمی سے جھلسی ہوئی زمین کا ذائقہ
ابھی تک ہماری زبان جلا رہا ہے
ہم کھڑکی پر پیشانی رکھے
بے ارادہ باہر دیکھتے رہتے ہیں
خالی دن کو
اپنی ناآسودہ خواہشوں سے بھرتے رہتے ہیں
ہر روز کسی نئے غم کے منتظر رہتے ہیں
ہمیں کون بتائے گا
کہ ہم زندہ ہیں

جمشید آفاق

کبھی ایسا بھی ہو جائے

کبھی ایسا بھی ہو جائے
کہ میری روح کی ویران کھیتی میں کوئی آکر
نہایت خامشی سے
چاہتوں کا بیج بو جائے
مجھے چاہت کی ان دیکھی طرب سے آشنا کر کے
غموں کا اک نیا طوفان میری آنکھ میں بھر کے
مرے گھر کی دواروں میں
زمانے کے نظاروں میں
کہیں چپکے سے کھو جائے
کبھی ایسا بھی ہو جائے

اکیلا چھوڑ کر
وہ خود کہیں
چپکے سے کھو جائے
کبھی ایسا بھی ہو جائے

کبھی ایسا بھی ہو جائے
کہ صحرا کی طرح تپتے ہوئے اس جسم کو میرے
کوئی آکر
نہایت خامشی سے
اس طرح سیراب کر جائے
مجھے اک خواب کر جائے
مجھے وہ چاہتوں کے ایک انہوں نے سمندر کی
نہاں گہرائیوں میں چھوڑ کر
چپکے سے کھو جائے
مرے احساس میں پھر تشنگی کا بیج بو جائے
کبھی ایسا بھی ہو جائے

کبھی ایسا بھی ہو جائے
کہ برسوں سے ترستی ان مری خالی نگاہوں میں
کوئی آکر
نہایت خامشی سے
چاہتوں کا رنگ بھر جائے
مجھے دیوانہ کر جائے
مجھے وہ چاہتوں کی خوبصورت سیر گاہوں میں
کبھی جو ختم نہ ہو پائیں
ان ایسی پناہوں میں

جیلانی کامران

بچے

جیسے
تازہ پھول کھلے ہوں
ایسے بچے کھیل رہے ہیں
چڑیاں ٗ طوطے ٗ مینا ٗ کوے
دیکھ رہے ہیں
بچے خوش ہیں ہنس رہے ہیں
پیڑ پہ چھوٹے بڑے پرندے چہک رہے ہیں
پھلواری میں پھول برابر مہک رہے ہیں
سورج
وقت کی دوڑ کو چھپ کر کھینچ رہا ہے
خوابوں سے آباد زمیں کو سینچ رہا ہے
پھلواری کے ماہر ہم تھے
دیکھ رہے ہیں
اچھی رت میں اچھے موسم دیکھ رہے ہیں
چند لمحوں میں
لمبے سائے آجائیں گے
شام کے ساتھ اداس اندھیرے چھا جائیں گے
بچے اپنی ماؤں کی گود میں کھو جائیں گے
خوابوں میں خود پھول بنیں گے سو جائیں گے
پھل داری میں شبنم
تازہ پھول چنے گی
ہر بودے میں بچوں کی آواز سنے گی

جانِ مسافر

گزر اے جانِ مسافر ٹھہر ٹھہر کے گذر
سرائے شہر سے
راہ و مقام و در سے گذر
ہزار بار گذر چاہے ایک بار گذر
خبر کے دل سے گذر عہد بے خبر سے گذر
ہوا ابھی سے وہاں منتظر ہے
رک رک کر
درخت فرش پہ بچھتے گئے ہیں
جھک جھک کر
زمیں کے تشنہ مقدر کی رہگذر سے گذر
دلوں کے بزم میں
آنسو ہیں تیری آمد کے
ہر ایک آنکھ میں
نقشے ہیں تیری آمد کے
چراغ شہر میں جلتے ہیں
تیری آمد کے
دلوں کی بزم میں اک آنکھ کے سفر سے گذر
وہاں گذرتے ہوئے میرے بام و در سے گذر

جیلانی کامران

پرندہ

ایک پرندہ
باغ میں تنہا چہک رہا ہے
ایک ہی پھول ہے اس موسم میں مہک رہا ہے
دور وطن سے دور پرندے ہانپ رہے ہیں
ان کے ساتھ ہزاروں لمحے کانپ رہے ہیں
کل کی صورت
آج کے نقشے بانٹ رہی ہے
ایک لکیر سی دل کے گوشے کاٹ رہی ہے
اک بچہ
اسکول کو جاتے رک سا گیا ہے
کیا جانے کس چیز کو دیکھ کے
جھک سا گیا ہے
قدموں کے دو چار نشاں ہیں۔ دور گئے ہیں
کچھ کاغذ کے پرزے پیڑ کے پاس گرے ہیں
اک جانب دیوار پہ دل کا نقش بنا ہے
بچہ جس کو غور سے اب تک دیکھ رہا ہے
اس بچے کی آنکھ میں
دنیا گھوم رہی ہے
باغ میں تتلی
پھول کا چہرہ چوم رہی ہے

مجھے اپنی خاطر

مجھے اپنی خاطر
وہ جھاڑی میں کھلتا ہوا پھول لا دو
مجھے اس کی خوشبو
زمانے میں جینا سکھائے گی
مجھے اس کی رنگت
بتائے گی قدرت کے اسرار کیا ہیں
جو کانٹوں میں رہتے ہیں
ان کی محبت کے اطوار کیا ہیں
تمہی ٹھہر جاؤ
کہانی میں پریاں جسے دیکھتی رہیں وہ تم ہو
یا۔۔۔۔وہ ہے
جو تتلی پکڑنے بھاگا ہے
یا تصور میں جس کے چمکتا ہوا سرخ دھاگہ ہے

حسن تنویر زیدی

برہنہ زندگی

برہنہ پا کسی دن آدمی دھرتی سے جائے گا
برہنہ شاخ کے نوحے ہواؤں میں گونجتے ہوں گے
کسی انجانی منزل کی سحرانگیزیاں
پل بھر میں اس کو
ششدر و حیران کردیں گی
فضائیں ماتمی ملبوس پہنیں گی
اسے پھر آدمیت آنکھ کا کشکول بخشے گی
کہے گی یوں سہاروں کی تمنا میں نکل جانا نہیں اچھا
ابھی اک لمحہ ستاؤ
ذرا ٹھہرو
تمہیں معلوم ہے
اک دن تمہاری مامتا نے جب تمہیں چلنا سکھایا تھا
تمہارے لڑکھڑاتے اور شکستہ گام سنبھلے تھے
مجھے روکو ابھی میں یاد کے زنداں میں محبس ہوں
ابھی میں سن نہیں سکتا
مجھے تلقین کرنا اور یہ کہنا
ابھی سے تم عدم آباد کی منزل کی جانب کیوں روانہ ہو
ابھی تو تھرتھراتے سانس کی آواز باقی ہے
کسی تنہا مسافر پیڑ سے لپٹی ہوتی
اک بیل کی صورت
گئے موسم کی کوئی بازگشت آواز دے تو رک جانا

حنیف ترین

سوچ

لہو تیرا پئے گی
سفیدی سر کو اک دن بخش دے گی
پسینہ بن کے ماتھے پر اگے گی
تجھے برباد کر کے بھی ہنسے گی
یہ آنکھوں کی نمی پی کر بڑھے گی
ارادوں میں پلے گی
تری آنکھوں کی نیندیں چھین لے گی
چلن پلکوں کو دے گی
کبھی محفل میں تنہا چھوڑ دے گی
کبھی اک بوجھ خود تجھ پر بنے گی
یونہی تا عمر تیرے ساتھ جب ہنس کر چلے گی
تو گونگی سوچ یہ کندن بنے گی
حیات نو کے ہر اک زاویے کو
کسی دن خود ہی روشن کرے گی

خادم رزمی

زمستانی ہوا تو......؟

زمستانی ہوا تو اک اداسی ہے
جو ہم ہجرت نصیبوں کے لبوں سے سسکیاں بن کر ابھرتی
ہے
دل و جاں کے پرانے زخم کرتی ہے ہرے پھر سے
اضافہ کچھ نئے زخموں' نئی ٹیسوں کا کرتی ہے
زمستانی ہوا تو ایک نوحہ ہے
جو ہر ویراں شجر پہ لکھ کے بجا ہے ہری رت نے
کسی اونچے ہرے پیڑوں بھرے پربت کی رنگ و نور پہنے
سبز چوٹی سے
زمستانی ہوا تو ایک کوڑا ہے
وہی کوڑا کہ پڑتا ہے ہمیشہ ہی انہیں بیدار چتوں پر
جو دن کو زہر پیتے ہیں سلگتی دھول دھوپوں کا
تو راتوں میں۔ بکھرتے ٹوٹتے تاروں کے دکھ میں اوس
روتے ہیں
زمستانی ہوا تو اک گجر ہے وہ صدا جس کی
اسی ماندے' تھکے ہارے مسافر پر ہی نت باب مسافت
کھول دیتی ہے
کسی ایسی اک ان دیکھی سی بستی کا
جو اس کا ایک سپنا ہے فقط سپنا
زمستانی ہوا تو اک ورق ہے جس پہ لکھا ہے
کوئی سپنا کبھی پورا نہیں ہوتا

کوئی بھی زخم اول تو نہیں بھرتا
جو بھر جائے تو اس کا داغ
اس سے بھی زیادہ ٹیس دیتا ہے

خلیل احمد

ایک نظم

بند آنکھوں میں ڈولتے منظر
اور خیال دماغ میں جسدم
گڈمڈ اور دھندلے ہو جائیں
پھر کھو جائیں
میں نیند میں اس دم آتا ہوں
اور گوشت پوست کا ایک وجود
مصروف تنفس پاتا ہوں

ایک نظم

رنگین شامیانے
زرق برق لباس
چھچماتا سونا
تمتماتے چہرے
ایک ہماہمی اور چہل پہل کا سا تھا
اور ایسے میں ایک آدمی
جس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے
پان بیچ رہا تھا

وہ

بہت بے چین رہتا ہے
کسی بھی کام کا آغاز کرلے
ادھورا چھوڑ دیتا ہے
کہ جیسے دور کچھ یاد آگیا ہو
کوئی بھی بھولے سے گر آنکھوں میں بس جائے
نگاہیں پھیر لیتا ہے
کہ جیسے اور ہی کچھ دیکھنا ہو
کبھی آجائے گہری نیند
اچانک ہڑبڑا کر جاگ اٹھتا ہے
کوئی جیسے
کہیں آواز دیتا ہو
کسی بھی شے میں دل لگتا نہیں اس کا
بہت بے تاب رہتا ہے
کہیں جانے کی جلدی ہے اسے شاید!

رخشندہ نوید

خود اذیتی

بھوک آخری حد تک جب بھری دکانوں میں
تن میں پھیلنے دیتی ہوں ڈوب ڈوب جاتی ہوں
اور آخر شب تک واپسی پہ ہاتھوں کو
جسم جلنے دیتی ہوں اور خالی پاتی ہوں

اپنی پیاس کا لمحہ خود اذیتی میرے
بیت جانے دیتی ہوں ساتھ ساتھ رہتی ہے
تیری آنکھ کب اپنے آنکھ اشک بھر کر بھی
پاس آنے دیتی ہے خالی دریا رہتی ہے

دیکھتی ہوں میں چپ چپ
بے بسی کے لہجے کو
چاٹتی ہوں میں پل پل
بے کسی کے لمحے کو

کچھ عجب طریقہ ہے
جاگتے میں سونے کا
خواب اک سلیقہ ہے
کھو کے بھی نہ کھونے کا

رفیق سندیلوی

اس رات بڑی خاموشی تھی

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو
اس رات دریچے خالی تھے
اور سڑکوں پر ویرانی تھی
آکاش کے نیلے ماتھے پر
مہتاب کا جھومر غالب تھا
اس رات بڑی خاموشی تھی
میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو
رستے کے بیچ سمندر تھا
اور اس کے پار پہاڑی تھی
مرے سر پر بوجھ تھا صدیوں کا
اور ہاتھوں میں کلہاڑی تھی
کچھ دور کنارے جوہڑ کے
بس مینڈک ہی ٹراتے تھے
اور پیڑ کے پتوں سے کیڑے
اک ساعت میں گر جاتے تھے
میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو
اس رات بڑی خاموشی تھی

رب نواز مائل

کیا کہانی تھی

اک حسیں منظر کے سب پہلو لئے
کیا کہانی تھی جسے پڑھتے ہوئے

میں نے یہ جانا کہاں بیکار ہے
ہستی خود گو مری نادار ہے

اک حسیں منظر کے سب پہلو لئے
کیا کہانی تھی جسے پڑھتے ہوئے

میں نے یہ جانا کہ کچھ بھی ہو یہاں
ہست صد آرام و ہست صد فغاں

حسن کوئی شوخ سا ہر اک سے ہے
حزن کوئی شوخ سا ہر اک سے ہے

زاہد حسن

کینوس

مجھے ہوائیں گننے کا شوق بہت ہے
پھولوں سا کھلا پھرتا ہوں
دل دکھ کی کتاب بن گیا ہے
لکھو تو خوشبو لکھنا
میں تیرے بدن کی درزوں میں مہک جاؤں گا
نیند آئے تو خواب لکھنا
میں تمہاری پلکوں کی دہلیز پر کھلوں گا
مانگو تو مجھے مانگنا
میرے حرفوں سے نقطے خالی ہیں
میرے حرفوں میں نقطے بھر دو
میرے سینے کی لوح شفاف پڑی ہے
اس میں دراڑیں ڈال دو
مجھے ہوائیں گننے کا شوق بہت ہے
پھولوں سا کھلا پھرتا ہوں
اور تیری زلفوں میں ویرانی بہت ہے

نظم

اے آبی جہازوں کے بادباں کھولنے والی لڑکی
ایک نیا معاہدہ قریب ہے
تجھے چاہیے
کہ تو نے جتنی اجناس پس انداز کی ہیں
ایک ایک کر کے ان پانیوں میں بہادے
جو معبد کی دیواروں کو چھو کر آتے ہیں
شاید، تو نہیں جانتی ہے
کہ گندم، جو اور دھان کی فصلیں
اب معیار تجارت نہیں ہیں
سیب، ناریل اور سنگتروں کی قاشیں
سب واہیات شغل ہیں
فاختائیں، زیتون کی شاخوں سے اڑ چکی ہیں
اور اندھا بارود بکھر جانے کو ہے
ابھی ہمارے اٹھائے کشت ہمارے ہاتھوں میں ہیں
ابھی بادباں نہ کھولو۔

ستار سید

موت سے مکالمہ

ترا تو کوئی دریچہ نہیں ہے حجلہ موت !
یہ روشنی کی کرن سی کہاں سے آئی ہے

یہ کیسے کھل گئے آنکھوں پہ حیرتوں کے جہاں
یہ کون ہے جو مرا حوصلہ بڑھاتا ہے

نظر میں تیر رہے ہیں مسافتوں کے نقوش
زباں پہ شہد شہادت ہے موت کی تلخی

کہ جیسے ممتا بھرے گرم دودھ کی لذت
یہ کس نے رکھ دیا محروم خواب آنکھوں پر

محبتوں سے بھرا نرم خواب آگیں ہاتھ
سنائی دیتی ہے لوری، کہ جس میں ماں نے مجھے

دیا تھا درس انا، اور عظمتوں کی دعا
مہک اٹھا مرے بچپن کا نو شگفتہ گلاب

سمندروں سا تلاطم فزا شباب مرا
نفس نفس میں تھا خوابیدہ رنگ و بوئے جمال

سر ستارہ کئی نقش پا نماتے ہوئے
:ووان رواں تھا میں ان دیکھی منزلوں کی طرف

مجھے لگا، کہ زمانہ ہے ہم سفر میرا
غبار رہگزر یاد بن گئے تھے جو لوگ

وہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلے
زباں پہ فخرو انا کے نئے ترانے لئے

دلوں پہ نصب کئے میں نے عظمتوں کے علم
ہزاروں دل مرا گھر تھے، ہزاروں مسکن تھے

شکست خوردہ تھے، زخموں سے چور چور تھے لوگ
خدا گواہ کہ پلکوں سے ان کے زخم سیئے

اداس آنکھوں میں پلتی ہوئی دعاؤں نے
کسی محاذ پہ پس پا مجھے نہ ہونے دیا

غروب جاں کا یہ منظر، یہ آخری لمحہ
انہیں دعاؤں کی تابندگی سے روشن ہے

ترے پرد لہو کی یہ لو، شب مقتل
اسے طلوع سحر تک امان میں رکھنا

ستیہ پال آنند

دردشیر ہے

دردشیر ہے
ہنٹر کی چوٹوں سے ہراساں
سدھا، سدھایا
سرکس کے کرتب میں ماہر
ایک جست میں
آگ کے پہیے کے شعلوں سے پار نکلتا
غراتا، غصے میں لپکتا
پیچھے ہٹتا!
دردشیر ہے
حکم کا بندہ
ہنٹر ظالم، جابر، حاکم
لیکن ایک لمحے کے بیت رہے وقفے میں
ہنٹر کے اٹھنے سے
ہنٹر کے پڑنے تک
حاکم
حکم کا بندہ دونوں
فاعل اور مفعول
برابر اک تصویر کے دو پہلو میں
دردشیر ہے
لیکن دردہی ہنٹر بھی ہے

سجاد مرزا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا

میں اپنے گھر کی دیواروں سے
کب مانوس تھا اتنا
پرائے دیس میں آکر
میں گھر جیسی فضا محسوس کرتا ہوں
وہاں بھی اجنبی تھا۔ اور
یہاں بھی اجنبیت کا
مزہ محسوس کرتا ہوں
تعجب ہے نیا موسم
نظر آتا نہیں مجھ کو
یہ نکتہ اب
کوئی بھی شخص
سمجھاتا نہیں مجھ کو

سعد اللہ شاہ

اپنے مرکز کی گونج

میں نے کیوں سوچا نہیں
کتنی صدیاں گم ہوئی ہیں لمحہ موجود میں
یہ گھڑی بھی
(عہد فردا میں)
کسی ماضی کی اک بے نام سی پہچان ہے
میں نے کیوں سوچا نہیں
کل سے آج اور آج سے کل
اس تواتر سے کسی بھی سمت جائیں ہم
اسی چکر میں رہتے ہیں
کہ یہ ساری ہی دنیا
اس تکونی سلسلے میں قید ہے
اب یہ ساری بند شیں تو
جسم سے ہیں ماورا اور بے کراں
سوچ کی حد سے شروع ہوتی ہے یہ وسعت کون و مکاں
میں نے کیوں سوچا نہیں تھے
یہ مکاں اور لامکاں
یہ مکاں اور لامکاں بھی
کس قدر نزدیک ہیں ' اور کتنے دور ہیں
بات کرلیں کس طرح سے ہم بہت مجبور ہیں
یہ بھی کچھ عیب ہے اور رابطے کی بات ہے
اک صدی کا دن ہے اس میں ایک صدی کی رات ہے

گرفت خواہش ذات

یہ خیال کیا یہ قیاس کیا
تری بات کیا تری ذات کیا
تری کج ادائی کے روپ میں
بھی واہموں کی برات کیا
تو گرفت خواہش ذات سے
کبھی اپنے آپ کو ڈھیل دے
تری بے حسی تری موت ہے
کوئی زندگی کی دلیل ہے
ترا حوصلہ ہے بقا تری
تری سوچ میں جو اڑان ہو
یہ اڑان تیرے وجود سے
پر و بال خود ہی بنائے گی
یہی سوچ حد گمان سے
تجھے پار لے کے بھی جائے گی

سلیم کوثر

اسم آب

جو تو تصویر کرتا ہے
جو میں تحریر کرتا ہوں
نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
مگر اپنا ہے یہ جب تک
اسے پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے
ابھی ماحول کو چاروں طرف سے جس کے صحرا نے گھیرا
ہے
مگر کب تک۔
ہوا چلنے میں کتنی دیر لگتی ہے
کوئی زنجیر ہے شاید ہمارے پاؤں میں اور راہ میں کافی
اندھیرا ہے
مگر کب تک۔
دیا جلنے میں کتنی دیر لگتی ہے
ہوائیں بادبانوں سے الجھیں اور کہیں ناقہ سواروں کو،
کوئی پیغام دیتیں
شام کے آنچل کو تھامے ساحلوں کی سمت آتی ہیں
پرندے۔۔ دائروں میں اڑتے پھرتے 'ابر کی چادر میں
لپٹے' رنگ برساتے
فضاؤں میں سفر کی داستاں لکھتے۔ کناروں کی طرف
جاتے ہوئے
منظر کو اپنے عکس میں تبدیل کرتے ہیں
اچانک سرپھری لہریں مجھے چھو کر گزر جاتی ہیں
اور میں اپنے تلوؤں سے نکلتی سنسناتی ریت کی
سرگوشیاں محسوس کرتا ہوں
وہی میں ہوں وہی اسباب وحشت ہی وہی ساحل
وہی تو ہے وہی ہنستی ہوئی آنکھیں وہیں ہے دل
تری آنکھوں میں رنگوں اور خوابوں کے جزیرے
جگمگاتے ہیں
سر مژگاں رو پہلی ساعتوں کے استعارے مسکراتے ہیں
ہنسی مہتاب بنتی ہے
پھر اس مہتاب کے چاروں طرف آواز کا ہالہ ابھرتا ہے
اور اس ہالے میں تیری انگلیاں نادیدہ منظر کو
طلسم خواب سے آزاد کرتی ہیں
ترے ہاتھوں کی جنبش دھوپ چھاؤں سے دھنک
ترتیب دے کر
خیالی تصویروں میں خد و خال کو آباد کرتی ہے
تری پلکیں جھپکتی ہیں
ستارے سے ستارا آن ملتا ہے
کہ جیسے شام ہوتے ہی
سبک آثار لہروں میں
کنارے سے کنارا آن ملتا ہے
یہ جو کچھ ہے، بہت ہی خوبصورت ہے
مگر اس کے لئے ہے
جو یہ سب محسوس کرتا ہے

تجھے معلوم بھی ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے
ابھی دن کا تھکا ہارا مسافر دھوپ کے خیمے سمیٹے دور پانی
میں
اترنے کے لئے بے تاب ہے دیکھو
یہ نیلا آسماں
اپنی گراں خوابی میں خود غرقاب ہے دیکھو
نہ جانے کیوں
سمندر دیکھنے والوں کو سورج ڈوبنے کا خوف رہتا ہے
کوئی ہے جس کو اسم آب آتا ہو
کناروں کی طرح ہر لمحہ کٹ کر تا ہو
زیر آب آتا ہو
سمندر آسماں کی راہداری ہے
مگر اس راہداری تک پہنچنے کا کوئی رستہ
بڑی مشکل سے ملتا ہے
یہ اسم آب
ساحل پر کھڑے نظارہ بینوں کی سمجھ میں
کس طرح آئے
کہ یہ تو ڈوبنے والوں پہ بھی مشکل سے کھلتا ہے
مگر کب تک؟
اسے کھلنے میں کتنی دیر لگتی ہے

سید صفدر حسین جعفری

گھر سرائے سے حرف محرمانہ

تمہیں گلہ ہے کوئی شے نہیں ٹھکانے پر
یہ گھر نہیں کوئی ہوٹل ہے یا سرائے ہے
کوئی مقام ہو ہوٹل ہو یا سرائے ہو
ہر ایک چیز ٹھکانے پہ رکھی جاتی ہے
ٹھکانہ شب بسری کا ہے اب یہ گھر تو نہیں
نہ کوئی مونس و غمخوار دل دہی کو ملے
نہ کوئی حرف شناسائی آگہی کو ملے
نہ کوئی یاد نہ خوشبو نہ قہقہوں کی کھنک
نہ موسموں کی دھنک اور نہ خواہشوں کی چمک
نہ برق و باد کی یورش نہ بجلیوں کی کڑک
جلو میں باد بہاری نہ موتیے کی مہک
جب اپنا دل ہی ٹھکانے نہیں تو جان جگر
اب ایسے گھر میں کوئی شے کہاں ہے
کس کو خبر

سیدہ رابعہ نہاں

صبح بہاراں

نسیم صبح بہاراں کا دور آیا ہے
فروغ حسن گلستاں کا دور آیا ہے

بہار آج نگاراں میں ہوگئی تحلیل
خمار چشم نگاہوں کا دور آیا ہے

کہاں سے لا کے مجھے دے مئے طرب ساقی
علاج گردش دوراں کا دور آیا ہے

زمین پاک سے اب پستیاں ہوئیں کافور
عروج عظمت انساں کا دور آیا ہے

نہ گاؤ قصہ ماضی نہ کل کی بات کرو
بڑے خلوص سے عزم و عمل کی بات کرو

جو بات کرنی ہو فکر و نظر کی بات کرو
کرونہ شام کی بلکہ سحر کی بات کرو

مجھے پسند نہیں گفتگو یہ منزل کی
خوشی کے لہجے میں لطف سفر کی بات کرو

جلاؤ سوز یقیں سے چراغ ہستی کا
نمود شعلہ آتش اثر کی بات کرو

رگ حیات میں بجلی کی رو گزر جائے
عروس زیست سنورتی رہے نکھر جائے

سید نثار حسین ہمدانی

خواہشوں کا تضاد

تم تو کہتے تھے
تم کو بھی میری طرح
خوب سے خوب تر کی رہی جستجو
اور یہ خواہش رہی
کوئی انساں ملے
جس سے الفت بھی ہو
جس کی باتوں میں شکوہ شکایت بھی ہو
جس کی خاطر یہ آنکھیں بھی اشکوں کی لو سے فروزاں
رہیں
جس کی قربت میں خوشیوں کی برسات ہو
ہاتھ میں ہاتھ ہو
مجھ سے ملکر یہ تم نے کہا تھا کبھی
وہ جو برسوں سے خواہش تھی پوری ہوئی
اب کسی خوب تر کی کوئی جستجو بھی نہ باقی رہی
پھر یہ کیا ہوگیا
کل کسی بات پر
تیری خواہش ہوئی
"میں فرشتہ بنوں"

شاہد اسلام دانش

ریگزاروں کے زرد موسم

مسافتوں کا حساب رکھنا کہ زندگی کے تمام رستے
جو ریگزاروں کے موسموں سے تمہیں مسلسل بلا رہے ہیں
یہی وہ موسم ہیں جو کہ اکثر محبتوں سے خراج لے کر
مسافروں کی جبیں سے موتی 'فضا سے شبنم کے پھول چن کر
کسی بھکاری کی طرح صدیوں سے آسماں کے تلے پڑے ہیں
کہ شاید ایسا کوئی مسافر کبھی تو ان کی بھی سمت آئے
جو زرد موسم پہ اپنے خوں سے محبتوں کے گلاب لکھ دے
جو بادلوں کی طرح سے گزرے تو خود کو ان پر نچوڑ ڈالے
کبھی جو سیلاب بن کے نکلے تو اپنی طغیانیوں کے قصے
انہی کے نام انتساب کر دے 'کبھی تو ان کے نصیب جاگیں
اگر یہ خشکی کے زرد موسم تمہیں بلائیں ضرور جانا
کہ تم نے سرسبز وادیوں کی مسافرت میں ہے عمر کاٹی
جہاں پہ پھولوں کے پیراہن بھی تمہارے قدموں کے منتظر ہیں
مگر کبھی زرد موسموں کی صدائیں سننا تو جان لینا
کہ ریگزاروں کی دھوپ تم کو صدائیں دے کر بلا رہی ہے
اگر یہ خشکی کے زرد موسم تمہیں بلائیں ضرور جانا
وہاں پہ شاید تمہارا ساتھی تمہاری خاطر کھڑا ہوا ہو

شبنم رومانی

کتھارس

شبنم پیارے! پھولوں کی قیمت اشکوں کے ہار نہیں
تم یاروں کے یار ہو' لیکن کوئی تمہارا یار نہیں

تم نے ایسے پھول کھلائے جنگل جنگل بات ہوئی
تم نے ایسے دیپ جلائے' دشمن کالی رات ہوئی

تم نے عشق کیا اور سمجھا حسن پہ حق رکھتے ہو تم
لیکن آج بھی آنکھیں پیاسی چہرے فق رکھتے ہو تم

شبنم! تم نے گلدانوں سے پھول چرائے خوب کیا
لیکن اپنی روح کو شاخ گل پر کیوں مصلوب کیا

تم اک سیدھے سچے شاعر' کھوٹ کپٹ کے میت نہیں
لیکن اتنا یاد رہے یہ اس دنیا کی ریت نہیں

تم ساحل پر ہو' لہروں کی زد میں تمہارا سایہ ہے
تم کو کیا معلوم' کہ تم نے کیا کھویا کیا پایا ہے

شاہین مفتی

اب سفر پہ کیا نکلوں

اب سفر پہ کیا نکلوں
جس قدر بھی رستے تھے
میرے گھر کو آتے ہیں
اور میرا گھر کیا ہے
صرف ایک صحرا ہے
جس کے خشک دامن پر
آنسوؤں کے دھبے ہیں
جس نے اپنے آنچل کو
آندھیوں سے باندھا ہے
ریت کی رفاقت میں
عرصہ توجہ بھی
آتشیں بگولہ ہے
آسماں کی آنکھوں میں
اشک آ بھی جائے تو
ابر چھا بھی جائے تو
بارشوں کی قسمت میں
ٹوٹ کر برسنے کا
سانحہ نہیں ہوتا
جس جگہ پہ صحرا ہو
نقش پا تو ہوتے ہیں
راستہ نہیں ہوتا

رابطوں کی دنیا میں

رابطوں کی دنیا میں
لفظ ہی وہ رستہ ہے
جس پہ لوگ چلتے ہیں
حرف اور معنی کی
ریشمی طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتا ہے
دور جا نکلتے ہیں
اجنبی جزیروں کے
بے یقین لوگوں میں
عمر بیت جاتی ہے
حرف اور معنی کے
رشتہ ہائے پیہم کا
کچھ سرا نہیں ملتا
لوٹنا بھی چاہیں تو
راستہ نہیں ملتا

آنیتو بکنبتو لوانڈا / شہزاد احمد

موگن کنبی

مری دھرتی وہ دھرتی ہے جہاں بارش نہیں ہوتی
پسینہ میری پیشانی کا ان فصلوں کا پانی ہے
اسی پھیلی ہوئی دھرتی پہ کچھ کافی کے پودے ہیں
مرا ہی خون انکی جگمگاتی سرخ رنگت ہے
نمو انکی مرے ہی خون کا رس ہے
ابھی جائے گی کافی
پھر پسے گی۔ پھر گھلے گی پیالیوں میں
رنگ کالا اس کا ہو گا
یہ سیاہی رنگ ہے میری مشقت کا
مشقت میری قسمت کی سیاہی بن گئی گویا
کبھی پوچھو پرندوں سے جو گاتے ہیں
مچلتی ندیوں سے جو سدا آوارہ پھرتی ہیں
بہت اونچی ہواؤں سے جو کھلیانوں سے آتی ہیں
سحر دم کون اٹھتا ہے!
مشقت کون کرتا ہے!
بہت لمبی مسافت میں
اٹھاتا کون ہے لکڑی کے بل، دانوں کے بورے اپنے کاندھے پر
پلی فصلوں کے خوشے کاٹتے ہیں ہاتھ کس کے!
اور کسے ملتی ہے مزدوری میں نفرت
جو کا بھوسہ، باسی مچھلی، چند پیسے اور پھٹے کپڑے

یہ میرے جسم پر جو نیل ہیں
سب میں نے مزدوری میں پائے ہیں
مگر یہ تو کہو وہ کون ہے!
جو کھیت میں فصلیں اگاتا ہے
مگر یہ تو کہو وہ کون ہے
جو ٹہنیوں پر پھول لاتا ہے
ذرا تم یہ کہو صاحب کو پیسے کون دیتا ہے
وہ پیسے جو مشینوں موٹروں اور عورتوں پر صرف ہوتے ہیں
مگر سچ ہے کہ کالے حبشیوں کا سر کچل دینا ہی بہتر ہے

پرندے جو کہ گاتے ہیں
مچلتی ندیاں جو خاک پر آوارہ پھرتی ہیں
بہت اونچی ہوائیں جو کہ کھلیانوں سے آتی ہیں
جواب اس کا وہی دیں گی
موگن کنبی موگن کنبی

مجھے تم پام کے پیڑوں پہ چڑھنے دو
مجھے پینے دو، دارو پام کا ہاں پام کا دارو
مجھے مدہوش ہونے دو
بھلانے دو مجھے سب کچھ
موگن کنبی، موگن کنبی

بوگو نینی / شہزاد احمد

زمین اور آسمان

یہ آسمان و زمیں بیکران ولا محدود
کہاں دعائیں مری قسمت آزمائی کریں
چھپالیا کبھی دو پتھروں کے بیچ میں سر
مگر اماں کی طلب سعئ رائیگاں نکلی
میں بھاگتا پھرا ویران سرزمینوں میں
ہزار گاؤں مرے راستے میں آتے گئے
مرے لئے کہاں ممکن تھا سانس لینا بھی
کہ توڑ سکتا تھا ہر سانس منظروں کا طلسم
شب سیاہ نے چرکے لگائے مجھ کو
سیاہ شب تو ہے آوارہ اور بے پروا
میں ایک کیڑا ہوں جس کے نہ پر نہ پاؤں ہیں
میں اک غذا ہوں سبھی نفرتوں کے سانپوں کی
کڑکتی دھوپ مرے سر پہ چھت بناتی گئی
سکڑ گیا ہے مرے فن کا تابدار ثمر
پڑی ہے پاؤں میں مسلی ہوئی وفا میری
میں اب دکھوں کی رداکو اتار پھینکوں گا
مرا لباس بس اب سے ہے سرخوشی کا لباس
مگر یہ میری خوشی تو نئی ہے میرے لئے
بس اب کٹیں گے مرے دن تری رفاقت میں
مرا بدن تری بانہوں کی قید میں ہوگا
مجھے ہوا کی طرح بے شعور کر دینا
جو سر پٹکتی ہے اور پائمال کرتی ہے
عطا نہ کرنا کبھی نفرتیں مرے دل کو
محبتیں مجھے دینا، جو دائمی ہو جائیں

لیوپولڈ سیوار سینگور / شہزاد احمد

حیران نہ ہو

حیران نہ ہو اے جان من
اگر کبھی۔ مرے گیت اندھیارے ہو جائیں
اگر کبھی۔ میں سر بکھراتی مرلی چھوڑ کے
لوہے کے تاروں والے ساز اٹھالوں
یا۔ ہرے بھرے چاول کے کھیتوں کی خوشبو
تیزی سے طبل جنگ میں ڈھل جائے
اب گونجتی ہے مرے کانوں میں
للکار قدیم خداؤں کی
گھن گرج ہے۔ جس میں توپوں کی
کل تک شاید ترے مطرب کی گلبانگ
قیامت تک کے لئے چپ ہو جائے
ہاں اسی لئے میرے گیتوں کی لے تیز ہوئی
اور ساز بجانے والے ہاتھ لہو میں ڈوب گئے
اے جان من
شاید میں کل بے چین زمیں پر گر جاؤں
تیری ڈوبتی آنکھ کا دکھ لے کر
گولوں کی کالی دھم دھم میں
تو چاند رات میں روئے گی
تجھے میری صدا یاد آئے گی
روشن روشن وہ میری صدا
ترے حسن سیاہ کے گن گائے ہیں
جس نے صدا

شہناز مزمل

بے آب لہجہ

سنو اک بات میری برق لمحو
مرا بے آب لہجہ بے یقینی کی صدا ہے
مرے لہجے کی تلخی یہ جہان کربلا ہے
سنو اک بات میری برق لمحو
یہ کشت جاں طلب کچھ کر رہی ہے
اسے تریاق جبر و ظلم لا دو
نہ اس کا حوصلہ تم آزماؤ
ندامت ہو گی تم کو آزما کر
مسلسل جبر کی چکی میں پس کر
یہ کشت جاں بنجر ہو گئی ہے
اسے تریاق جبر و ظلم لا دو
سنو اک بات میری برق لمحو
بہت روشن ہوئے ہیں چاند تم سے
مرے رستے میں تاریکی بہت ہے
ذخیرہ روشنی کا تم بنے ہو
سر افلاک اڑتے پھر رہے ہو
یہ پرواز جنوں تم کو مبارک
مجھے بس روشنی تھوڑی سی دے دو
دیئے کچھ اور راہوں میں جلا دو
اندھیروں کا ذرا سا کرب بانٹو
مسافر کی سزا تھوڑی سی کم ہو
اجالوں میں وہ تھوڑی دیر جی لے
اسے تریاق جبر و ظلم لا دو
سنو اک بات میری برق لمحو
اسے تریاق جبر و ظلم لا دو

شفیق احمد

ہم انا میں زندہ ہیں

وہ بھی یہ سمجھتی ہے
جانتا تو میں بھی ہوں
کھیل میں اناؤں کے
دکھ تو سہنا پڑتا ہے
حبس زاد موسم میں
گھٹ کے رہنا پڑتا ہے
لمحہ لمحہ مرتے ہیں
ہم انا میں زندہ ہیں
شہر اجنبیت کی
جس فضا میں زندہ ہیں
اس میں سانس لینا بھی
اک عذاب جیسا ہے
پھر سے اپنے ملنے کا
خواب، خواب جیسا ہے
کھیل جب انا کا ہو
دکھ تو سہنا پڑتا ہے
جاں فگار موسم میں
مرگ زار موسم میں
یونہی رہنا پڑتا ہے
جانتی تو وہ بھی ہے
میں بھی یہ سمجھتا ہوں

شفیق سلمی

انتظار ساعت معتبر

ابھی ہیں راستوں کے درمیاں آئینے آویزاں
ابھی بے نقش چہروں کو لئے
تاریکیوں کی دھند سے باہر نہیں آتا
ابھی کم ظرفیوں کی رت نہیں بدلی
گھروں میں بند رہنا اور دعا کرنا
کہ اپنے نقش
چہروں پر سجانے کی گھڑی آئے

ضرر وصفی

روشنی سے نفرت ہے

سرمئی اندھیروں میں
خواب بنتا رہتا ہوں
روشنی سے نفرت ہے
زندگی وہ ناگن ہے
زہر جس کی نس نس میں
رقص جس کی فطرت ہے
آدمی سپیرا ہے
راگنی سے الفت ہے
نام کو ہی دنیا میں
پیار اور محبت ہے
کس سے کس کو چاہت ہے
اپنی اپنی بھوکیں ہیں
اک فریب دل داری
یہ وفا ہے عیاری
غم کی جیسے ہو کھائی
آدمی کی تنہائی
کھال اور پتوں سے
ڈھانکتا تھا جسم اپنا
جنگلوں میں غاروں میں
پھر ہوس کی شہزادی
لے رہی ہے انگڑائی
اک نئی یہ ہجرت ہے

سرمئی اندھیروں میں
خواب بنتا رہتا ہوں
روشنی سے نفرت ہے
سینکڑوں برس پہلے
آج کا یہ انساں تو
صرف ایک بندر تھا
میرے دور کا انساں
آج اک درندہ ہے
یہ مری صدی کا تو
اک نیا کرشمہ ہے
دھرم اور مذہب کے
نام پر خرابہ ہے
جہل کا اندھیرا ہے
یہ گھڑی ہے ماتم کی
نفرتوں کے صحرا میں
آدمی کا ڈیرا ہے
آدمی کے چہرے سے
آدمی کو نفرت ہے
آدمی کا سرمایہ بغض اور عداوت ہے
سرمئی اندھیروں میں
خواب بنتا رہتا ہوں
روشنی سے نفرت ہے

ضمیر اظہر

لمحوں کے رنگ

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے
لپٹ کے اپنے ستم زدہ ' نیم جان ' بے بس غموں سے
روؤں
سسک سسک کے
بلک بلک کے
مثال طفل یتیم روؤں
ہزار آہوں کے ساتھ مفلوج آرزوؤں کے سر پہ شفقت کا
ہاتھ پھیروں
فریب پرور تسلیوں سے
غریب ' بے نور بوڑھی قسمت کو مژدہ زندگی سناؤں
کہ عین ممکن ہے کل ہی تو چاند جیسا شفاف نور پا کر
شباب کی چاندنی بنے ایک بار پھر
اور مسکرائے

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے
کسی بھی غم خوار سے نہ بولوں
نہ بھید اپنا ذرا بھی کھولوں
نصیب جتنی بھی تلخیاں ہیں
اذیتیں ہیں
صعوبتیں ہیں
سبھی کو صبر و رضا کے پیالے میں گھول کر ایک روز پی
لوں

جو آگ سینے میں جل رہی ہے
جو پیاس آنکھوں میں مضطرب ہے
کوئی نہ ان کو بجھانے آئے
نہ خود ہی میں بھول کر بجھاؤں

جہان نادیدہ

کبھی تو دیکھوں مرے خدایا
اک ایسی دنیا کہ حسن جس میں وفا کے رنگین
موتیوں سے سجا ہوا ہو
جہاں محبت کے بے خزاں پھول
ہر طرف مسکرا رہے ہوں
شجر شجر امن کے پرندے
طرف فزا گیت گا رہے ہوں
ہری بھری وادیوں میں طاؤس عافیت کے
ٹہل رہے ہوں
جہاں فقط پیار کی فضا
پیار کی ہوا
پیار کی صدا ہو
بشر --- بشر کے لئے دوا ہو
جہاں خلوص اور نیکیاں
تتلیوں کے پیکر میں جا بہ جا لہلہا رہی ہوں

طارق جاوید

زمین خواب

فغاں! کہ ختم ہوا دور آگہی کا طلسم
زمین خواب بتا آج تجھ میں کیا بوئیں
گلاب قلب و نظر سایہ ببول ہوئے!
بہشت ارض کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے!
فضا میں رقص جہنم کے زاویے چمکے!
زمین خواب! تری روشنی تھی روح حیات!
زمین خواب! کہاں گم ہوا ترا چہرا؟
بتا! کہ کش مکش دہر ختم ہو آخر؟
بتا! کہ ہستی تاریخ دوراں نیست ہوئی؟
بتا! کہ شر کے مقابل نہیں خیر کا نور؟
اگر تو کہتی ترے کاسہ گدائی کو
ہم اپنے خواب فروزاں سے جگمگا دیتے!
ہم اس میں ایک زمانے کا سر جھکا دیتے!
نجوم و ماہ تری راہ میں بچھا دیتے!
زمین خواب! اگر تجھ کو یہ قبول نہ تھا
تجھے گوارا نہیں تھی بہشت باب بقا!
کمند پنجہ ابلیس تھی خوشی تیری
سکون قلب میسر تجھے کہاں ہوتا
کمال جوہر مزدور و خون دہقاں سے!!

عابد خورشید

بچھڑتے ہوئے دوستوں کے نام

یہ دوست میرے
رفیق مرے
کہ جن کی چاہت لہو کی صورت
مرے رگ و پے میں دوڑتی ہے
تو ذہن پر ایک خیال بن کر
حسین احساس چھوڑتی ہے
میں ان کی باتوں کا لمس عابد
نظر سے دل میں اتارتا ہوں
یوں ان کی باتوں کی روشنی سے
میں اپنی باتیں سنوارتا ہوں
مجھے خبر ہے
میں اشک بن کر سکوت شب میں بہا کروں گا
بچھڑ کے مجھ سے یہ جا رہے ہیں
تو سوچتا ہوں
جنھوں نے میرے خرد سے کوئی سوال پوچھا تو کیا کروں گا
تمھی بتاؤ۔ مرے رفیقو
بچھڑ کے تم سے میں کیا کروں گا

عابد ودود

روٹی

ساری خدائی سے بہتر ہے
روٹی کا اک ٹکڑا
میرے مولا
تیری یہ تخلیق
جس کے سہارے
قائم و دائم
موت و حیات کا پیارا رشتہ
کتنا عظیم ہے تو اے مولا
اور عظیم تر تیری
تخلیق

التجا

تم میری آنکھیں لے لو
اور مجھے
نابینا چھوڑ دو
تاکہ تم میری آنکھوں سے
بینا بن جاؤ

انسان

درھم و دینار
مال و دولت
روپیہ و پیسہ
بہن بھائی بن گئے ہیں
انسان؟
کس چڑیا کا نام ہے؟
وہ پوچھتے ہیں

الٰہی

الٰہی
زندگی کی شام ہونے سے پہلے
اس عالم کے لئے منصف بھیج
درد کا وہ درماں بھیج
جس سے ہر جھوٹ کی دیوار گرے
ہر سر پر تری تلوار گرے
روشنی کا کوئی در وا ہو جائے
اور عالم میں سویرا ہو جائے

عارف ایوبی

انجیر کا پتہ بولتا ہے

چھت سے لٹکتے فانوس کی
پیلی روشنی میں
انجیر کا پتہ کہتا ہے
زمین کی حد بندیوں سے
ذہن انسانی ہٹ جانا چاہئے
زندگی اور وقت
اور کچھ نہیں
آدمی کا جسم ہی اس کا وطن ہے
اور-----
ہر شخص کو ایک دوسرے کے
وطن کی حفاظت کرنا چاہئے
زمین کی حد بندی کر کے
اس کی حفاظت کرنے والے
خون کی ہولی کھیلتے ہیں
مری جانب اس طرح مت دیکھو
میں اپنے دور کا پیغمبر ہوں اور
خاطر نشان رہے
کہ اب میری محبت اتنی شدید نہیں
کہ اسے اپنی عزت یا اپنی آن پر
ترجیح دے سکوں
ہاں تمہارے وطن کی حفاظت
میرا فرض ہے---حالات
دقیانوسی طرز فکر کی
پیداوار ہیں
ان کی فکر---؟
آؤ کہ تمہارے وطن کی حفاظت کروں
ورنہ تمہارے وطن کی
اینٹ سے اینٹ بج جائے گی
میرے سامنے
سمندر کے کنارے
ڈوبتے سورج کی پیلی روشنی میں
بہت سنہرا راستہ ہے

عامر سہیل

موم زادے

خوف کی باندیوں سے کہو
درد کی مشعلیں نہ بجھیں
ان کے پاؤں میں جو
زخم کی جھانجریں ہیں
چھنکتی رہیں
پیاس کے زہر کی اپنی تاثیر ہے
جن کے لفظوں کی گردن
میں بے ربط، سہمی ہوئی
داستانوں کا اک طوق ہے
ایک زنجیر ہے
جو خمیدہ جہانوں کی
بیساکھیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
آپ ہی جھک گئے
پتھروں میں حرارت کی لو
پھونکتے پھونکتے
آپ پتھرا گئے
وہ ارادے ہیں ہم
خوف کی باندیوں سے کہو
درد کی ٹہنیوں میں پروئے ہوئے
رات کی سسکیوں کے لبادے میں ہم
دھوپ کی ریت آنکھوں میں
کیسے بھریں

عارف پرویز نقیب

خراج

وہ سارے لمحے وہ سارا منظر
جو بھول جاؤ تو بھول جانا
نہ یاد رکھنا......
کسی شجر کی گھنیری چھاؤں میں ہم ملے تھے
کہ میں نے تم کو نجانے کتنی صدائیں دی ہیں
یوں نرم سینے میں سنگ دھڑکیں گے
سوچا کب تھا
کہ تو نے اپنا وجود پتھر بنالیا ہے
نہ سن رہے ہو
نہ دیکھتے ہو
نہ سوچتے ہو
نہ بولتے ہو
کہ میں نے تم کو نجانے کتنی صدائیں دی ہیں
کبھی جو گزرو تو یاد رکھنا
گھنیری چھاؤں میں ہم ملے تھے
وہاں ہواؤں سے اڑ رہے ہیں جو زرد پتے
بطور تحسیں
تم ایسا کرنا
خراج دینا، محبتوں کا
کہ اپنے پیروں سے روند جانا

عظمیٰ فاروقی

پرسش

دور کہیں پر نظریں گاڑے
سوچ میں ڈوبی آنکھیں لے کر
ہاتھوں میں پنسل کو تھامے
میز پہ کاغذ کو پھیلائے
اتنے چپ چپ، اتنے گم سم
کس کی یاد میں بیٹھے ہو تم
کس کو سوچ رہے ہو؟!!!

انتظار

تیز برستی بارش میں وہ
اپنے گھر کی چھت پہ تنہا
پتھر کی دیوار سے لگ کر
جانے کب سے بھیگ رہی ہے
کس کا رستہ دیکھ رہی ہے
کس کو کھوج رہی ہے!!!

عادل فریدی

احتیاطاً

میں ابھی زندہ ہوں لیکن
شہر کے گنجان قبرستان میں
وارث ناعاقبت اندیش نے
(یہ سوچ کر
دفن ہوتے آ رہے ہیں ہم سبھی
اک دوسرے کی قبر میں)
احتیاطاً
ایک بوسیدہ شکستہ قبر پر
کر دیا ہے نصب لوگو
کتبہ میرے نام کا

عرفانہ عزیز

وہ چاند چہرہ

وہ چاند چہرہ
وہ چاند چہرہ جسے میں سوچوں
تو ہوں منور سیاہ راتیں
وہ شاخِ مژگاں کہ جس پہ اتریں اگر ستارے
تو پونچھ کر اپنے آنچلوں کی حنا سے سارے
دراز قامت، کشادہ شانوں پہ
کہکشاں اپنا نور وارے
وہ نرم لہجہ مثالِ خوشبو
وہ رودِ شیریں تمام باتیں
وہ حرف سادہ کہ نیلگوں آبشار جیسے
صبا کے انداز سے گلوں کو
چمن میں آئے قرار جیسے
وہ طبعِ روشن کہ نور جس کا
جہاں میں بدلے تمام ذاتیں
فقط محبت ہی اہلِ مسلک کا دین ٹھہرے
نگاہ و دل کا امین ٹھہرے
وہ بت شکن شہر آزری میں
جو طرحداروں میں خوش ادا ہے
قبول مجھ کو کہ نوبہاروں کی وادیوں میں
بلند شاخوں کا پھول ہے وہ
مگر سرِ سبزہ زارِ ہستی
پرندِ گلشن بھی آبرو اپنی جانتا ہے

مثالِ صورت ہزار ہوں میں
کہ جس کو سن کر گلاب شاخوں پہ جاگتا ہے
میں خودشناسی کا زہر شبنم کے آبگینوں سے پی چکی ہوں
میں عہدِ رفتہ کی وادیوں میں
قبا دریدہ بہار کے زخم سی چکی ہوں
مگر فراموشیوں کا موسم مرے وطن میں ٹھہر گیا ہے
مرے لئے تو وہ اجنبی دیس مہرباں تھا
جو میری راہوں میں گل فشاں تھا
میں نیلے چشموں کو ساتھ لائی ہوں چشمِ تر کے
سمندروں میں
میں آنسوؤں کی روپہلی لہروں میں ڈھل رہی ہوں
میں موتیے کی مہک کی صورت
وطن کی مٹی میں گھل رہی ہوں
مگر میں پہروں یہ سوچتی ہوں
یہی بہت ہے کہ وہ تمنا کی سبز بیلوں پہ
چاند کی طرح رک گیا ہے
وہی مرادِ درد آشنا ہے
رہے سلامت وہ چاند چہرہ
رہے سلامت وہ طرحداری
جو مہرباں ہو وہ سنگِ در تو
قبول ہے رسمِ جاں نثاری

عشرت رومانی

وقت کی چھاؤں میں

زخم رستے رہے دل سلگتے رہے آنکھ جلتی رہی دن
گزرتے رہے
وقت کی چھاؤں میں وصل کی ساعتیں
رقص کرتی رہیں گیت گاتی رہیں
لمحہ شوق کو آزماتی رہیں
دفعتاً کسی کی آہٹ پہ صدیوں کی سوئی ہوئی سرد
چنگاریاں
دل کے آتش کدے میں سلگنے لگیں
جاگتے خواب بننے لگے
مرمریں پھول سے جسم خوشبو لئے
وقت کی چھاؤں میں کسمساتے رہے
جاگتے جاگتے یہ نظر تھک گئی
یوں اندھیرا رہا یہ سحر تھک گئی
تھک گئی وصل کی ساعتیں
لٹ گئیں شوق کی جنتیں
وقت کی چھاؤں میں اپنی لاشیں اٹھائے ہوئے زندگی
یوں چلی جا رہی ہے کہ جیسے یہاں
کوئی آنسو نہیں کوئی جگنو نہیں
موسم گل کا اب کوئی پہلو نہیں
عارضوں کی قسم جگنوؤں کی قسم
چاند کی چمپئی چلمنوں کی قسم

موسم گل کا اب کوئی پہلو نہیں
عظمت گل کہاں حسن آدم کہاں
شاخ در شاخ اشکوں کی شبنم کہاں
جانے کس راہ میں موج گل کھو گئی
شہر در شہر پھولوں کے پرچم کہاں
کوئی چادر نہیں کوئی خوشبو نہیں
موسم گل کا اب کوئی پہلو نہیں
وقت کے دوش پر وقت کی چھاؤں میں
اب یہی موسم گل کا عنوان ہے
زخم رستے رہے دل سلگتے رہے
آنکھ جلتی رہی دن گزرتے رہے

عزیز اعجاز

دلدل

الارم سن کے میں جاگا تو دیکھا
گھڑی میں سات بج کر دس منٹ تھے
میں جلدی سے اٹھا
مجھ کو نہانے ناشتہ کرنے سے دفتر تک پہنچنے میں
بہت کم وقت لگتا ہے
پھر اس کے بعد سارا دن
میں گونگی اور بہری فائلوں میں سر کھپاتا ہوں
مرے اعصاب
ٹائپ رائٹر کی ٹھک ٹھکا ٹھک ٹھک سے
جب ماؤف ہو جاتے ہیں
تو میں چائے کا اک بد مزہ کپ
اپنے ہونٹوں سے لگا کر
چسکیاں لیتے ہوئے محسوس کرتا ہوں
کہ میرے جسم میں اس زہر کی مقدار
کتنی بڑھ گئی ہے
سگریٹوں کی راکھ میں ہر روز
خود کو دفن ہوتا دیکھنے سے تو
یہ بہتر ہے
کہ میں اپنی حیات رائیگاں کو
تیشۂ سم سے تلف کر دوں
مگر دل کے کسی گوشے میں
جینے کی کوئی خوابیدہ خواہش
جاگ اٹھتی ہے

فنا کی انتہا سے ہی بقا کی ابتدا ہوتی ہے
اپنے اپنے دکھ سب جھیلتے ہیں
شام ڈھلتے ہی
میں جگمگ شاہراہوں سے گزر کر
ان دکانوں تک پہنچتا ہوں
جہاں رو کڑ بہی کھاتے لکھت کرنے کے
مجھ کو ہر مہینے پانچ سو چھ سو روپے ملتے ہیں
جن سے گھر کرایہ دے دیا جاتا ہے
یوں ہر رات دس گیارہ بجے میں لوٹتا ہوں
اور سو رہتا ہوں
بس پچھلے کئی برسوں سے یہ معمول ہے میرا
خدا جانے
کہاں سورج نکلتا ہے کہاں پر ڈوب جاتا ہے
چھتوں پر چاندنی کب آ کے اٹھلاتی ہے
رت کیسے بدلتی ہے
کدھر سے موجۂ گل کا گزر ہے
سوکھے پتوں پر قدم پڑنے سے جو ساز طرب بجتا ہے
جانے کون سنتا ہے
پرندے صبح دم کن آنگنوں میں چہچہاتے ہیں
ہوا لہرا کے چلتی ہے
تمنا روح میں کروٹ بدلتی ہے
کوئی موسم تو مجھ کو بھی پکارے
میں سارے منظروں سے کٹ گیا ہوں

ملتمہ شبلی

شاعری صورت گری

(علامہ اقبال کی روغنی تصویر کو دیکھ کر)

اک برہمن
آشنائے رازہائے بے خودی
اک مسلماں
محرم سرخودی
جس نے جسم مردہ میں الفاظ کے
روح معنی پھونک دی
مور بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کر دیا
تیرگی شب میں جیسے اک چراغ
تشنگی کے ہاتھ میں جیسے ایاغ
ریگ زار وقت میں مل جائے جیسے کوئی باغ
پارہ پارہ زندگی کا ہم سفر
ریزہ ریزہ آدمی کا راہبر
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آج اس کی شاعری
صورت گری کے روپ میں
سرمہ چشم بصیرت ہو گئی
شاعر مشرق کے چہرے سے اٹھا تو ہے نقاب
ہے تمنا
ذہن و دل تک اس کے ہم ہوں باریاب
ذرہ خاکی ہو رشک آفتاب
زندگی ہو رو کش صد ماہ تاب
موت بھی ہو زندگی کی ہم رکاب!

علی محمد فرشی

جنگل کے راستے میں پڑی ہوئی نظم

شکاری!
بہت تھک چکے ہو
گھنے سائے میں ٹوٹ کر اس طرح گر پڑے ہو
کہ جیسے پرندہ
کسی آتشیں تیز گولی کی رہ کاٹ کر گر پڑے
واقعی تھک چکے ہو؟
تمہاری (پرانے زمانے کی) بندوق بھی تھک چکی ہے؟
تمہارا وفادار کتا کہاں ہے؟
تھکن اب اسے بھی تو کھانے لگی ہے
کبھی بھربھری ہڈیوں کو چبانے لگی ہے
بہت تھک چکے ہو
اب آرام کرلو
درختوں سے نیچے اتر کر
ہوا میٹھی لوری سنانے لگی ہے
تمہیں نیند آنے لگی ہے
(جہاں تم زمیں پر پڑے ہو) یہاں سے ذرا دور آگے
پرانے درختوں کے سائے تلے
ایک دلدل تمہارے لئے نرم بستر لگانے لگی ہے!

کبوتر صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے

پیاسا کبوتر
صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے
صراحی کے اندر اترنے کی خواہش
کنارے پہ بیٹھی ہوئی ہنس رہی ہے
صراحی کے پیندے میں پانی
چمکتا ہوا آب سیمیں
کبوتر کے اجلے پروں پر
بکھرتا ہوا آب سیمیں
کبوتر کی آنکھوں سے
بہتا ہوا آب سیمیں
کبوتر کی آنکھوں سے رستا ہوا دکھ
صراحی کا دکھ ہے
صراحی کے اندر چمکتا ہوا دکھ
کبوتر کا دکھ ہے
صراحی کا دکھ ہے
پیاسا کبوتر
صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے

عافر شہزاد

میرے آنسو نہ پونچھو

مرے آنسو نہ پونچھو
اس کی یادوں کے کنول ہیں
کھلنے دو ان کو
دریچے بے صدا ہیں
اس کی خوشبو
بالکونی میں لگی بیلوں سے لپٹی ہے
میں چہرے بھول جاتا ہوں
مگر وہ ادھ کھلی آنکھیں
زمانہ جن کے نیلے کینوس کے قوس کے اندر
مقید ہے
میں ان کا عکس ہوں!
آئینہ 'پس منظر بھی 'منظر بھی
مرے آنسو نہ پونچھو'
گرنے دو ان کو
کہ آنکھوں کے جزیروں میں
(جہاں پر زرد موسم ہوں)
کنول کھلتے ہوئے اچھے نہیں لگتے

غزل جعفری

گواہی

یہ گواہی دے سکتے ہو
مگر کیسی گواہی
وہی جو میں چاہوں
مگر کیوں؟
تم تو کہتے تھے تم ضرورت مند ہو
ہاں بہت ضرورت مند ہوں
تو پھر یہ گواہی دے دو
تم نے ایسا ہوتے دیکھا تھا
مگر؟
کیا تم نہیں چاہتے
تمہارے گھر کا چولہا ہمیشہ جلتا رہے

غلام محمد قاصر

کشمیر کے لئے ایک نظم

زندہ ہے پر مانگ رہی ہے جینے کی آزادی
دیو کے چنگل میں شہزادی یہ کشمیر کی وادی

حد نظر تک سرو و صنوبر ہیں بھی اور نہیں بھی
ظالم کے دربار میں جیسے مہر بہ لب ہیں فریادی

شاید ایسے اک میت پامالی سے بچ جائے
ماں نے کم سن بچی کی دریا میں لاش بہادی

سوئے ہوئے ضمیر نے اب تک دروازہ نہیں کھولا
ہم نے تو ظلم کے پہلے ہی دن زنجیر عدل ہلادی

حسن لکیریں کھینچ رہا تھا سادہ سے کاغذ پر
آزادی کا لفظ لکھا کشمیر کی شکل بنادی

کہانی کا سفر

کن خرابوں سے وہ آسیب ادھر آئے تھے
رات میں لپٹے ہوئے سائے نظر آئے تھے

خواب سے خواب ملے اور سر گرداب ملے
راہ کے سارے سمندر ہمیں پایاب ملے

ایسے لمحات بھی دوران سفر آئے تھے
چاند تارے مرے پرچم پہ اتر آئے تھے

فرحت عباس شاہ

چاند نکلے تو کیا

چاند نکلا نہیں
اور جو نکلے بھی تو
چاند راتوں سے اپنی پرانی شناسائی کے خوف سے
ایک مدت سے ہم آسمانوں کی جانب نہیں دیکھتے
آنکھ برسی نہیں
اس لئے
کہ دکھوں اور غموں کی فضاؤں سے در آنے والی
گھٹاؤں کو ہم
راستوں میں کہیں دور چھوڑ آئے ہیں
اور پھر ہم ہیں اب
بارشوں کی رتیں اپنی آنکھوں میں لانے کی ہمت نہیں
یاد آیا نہیں
وہ جو بھولا نہیں تھا کبھی بھی ہمیں
وہ جو اترا نہیں تھا کبھی ذہن سے
ایک مدت سے وہ یاد کی بستیوں کے کھنڈر میں کہیں دفن
ہے
اور اس نے ابھی تک بلایا نہیں
اب تو کچھ بھی نہیں
زندگی بھی نہیں جسم کا ڈھیر ہے
سانس کے جرم میں فیصلے کی گھڑی اک ذرا دیر ہے
منتظر ہیں کہ بس فیصلے کی گھڑی اک ذرا دیر ہے

چاند نکلے تو کیا؟
آنکھ برسے تو کیا؟
یاد آئے تو کیا؟

بے بسی

چلے آتے
تمہارے پاس لیکن
جدائی
راستہ روکے کھڑی ہے

لرزش

آہ بھرتا ہوں
تو خوف آتا ہے
سانس میں
موت کی آمیزش ہے

موت

رہ نوردوں کو
کوئی چاٹ گیا
راستہ دور تلک
خالی ہے

فرخ یار

ایک نظم

عمر بھی ایک دن
خواب کی طرح ڈھل جائے گی
اور میں واہموں کا اثاثہ لئے
حدت نفس نامعتبر کے کڑے پہر میں
اپنی مطلوبہ ونگین کی امید پر
نقش ہونے کی حد سے گزر جاؤں گا
پو کروں میں پروئے گئے دو چروں سے پرے
مشتری کی تراشیدہ مسکان کے اس طرف
جس طرف میرے اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں
اپنے ماضی سے شرمندہ جسموں کے انبوہ میں
سانس لیتے ہوئے اب مجھے ۱۴واں سال ہے
آرزو نصف شب کی جدائی میں ہے
بے ستوں سلسلہ، رتجگوں سے بھرے
موسموں کی مزاج آشنائی میں ہے
اور میں حدت نفس نامعتبر کے کڑے پہر میں

ٹھہرائے دل

عمودی زائچوں سے منحرف ہونے کا لمحہ آن پہنچا ہے
ٹھہرائے دل
ٹھہر کہ میں ذرا اگلی گلی سے ہو کے آتا ہوں
ٹھہر کہ اب نویسندہ بیاں تبدیل کرنے پر نہ قادر رہے نہ
مائل ہے
وہ دن تو ہم گزار آئے
جنہیں سورج نظرانداز کرتے ہیں
جنہیں اندراج کی منزل نہیں ملتی
ٹھہرائے دل
ٹھہر کہ اب زمیں دھیمے سروں میں
آسماں کی لے اٹھائے گی
شب حکم مساحت ختم ہوگی
اور قاصد بستیوں میں حکم حاصل لے کے پہنچیں گے

قائم نقوی

خوش رنگ موسم کی خوشبو

حسن یقیں کے رنگ سنہرے
ہر اک بوند لہو کی جیسے
ٹپکے تو پھر جیون ٹھہرے

ان دیکھے سفر کی خواہش

سورج چاند نکلنا چاہیں
پھر سے جیون کے رستے پر
پاؤں پاؤں چلنا چاہیں

بے یقینی

کیسے ہیں سپنوں پہ پہرے
سپنوں میں تعبیریں بند ہیں
کیسے ہم تعبیریں ڈھونڈیں

کرامت بخاری

میں

میں اک انداز ہوں
ترے اعجاز کا
حریم ناز کا
کسی آواز کا

میں اک سنگیت ہوں
دکھی انسان کا
دل نادان کا
کسی انجان کا

میں اک احساس ہوں
تھکے مزدور کا
غموں سے چور کا
کسی مجبور کا

میں اک تحریر ہوں
سواد شام کی
خیال خام کی
کسی کے نام کی

احساس

چہرے کی وہ کتاب
جس کا ہر ایک لفظ
میں نے نہیں پڑھا

دل کے افق پہ بھی
اس کے بدن کا دن
اب کے نہیں چڑھا

شاداب سا کنول
آنکھوں کی جھیل میں
کب سے نہیں کھلا

پتھرا گئی ہیں آنکھیں
احساس مر گیا ہے
موسم نہیں مرا

کرامت بخاری

خواب

کوئی خواب تھا کہ خیال تھا
شب ہجر صبح نور تک

ہر بزم تھا وہ سجا ہوا
کہیں اپنے بام غرور تک

جیسے دیکھتے جیسے ڈھونڈنے
یہ نظر گئی کوہ طور تک

اسے سوچتے رہے رات بھر
بڑی دیر تک بڑی دور تک

نظم

میں اک انداز ہوں۔ ترے اعجاز کا
حریم ناز کا
کسی آواز کا
میں اک سنگیت ہوں۔ دل نادان کا
کسی انجان کا
دکھی انسان کا
میں اک احساس ہوں۔ تھکے مزدور کا
غموں سے چور کا
کسی مجبور کا
میں اک تحریر ہوں۔ سواد شام کی
خیال خام کی
کسی کے نام کی

ڈاکٹر کوثر محمود

اسے کہنا

اسے کہنا
اگر اشکوں کی لڑیاں ٹوٹ جائیں تو
یہ موتی پھر نہیں ملتے
اسے کہنا
کہ خودرو پھول آنگن میں نہیں کھلتے
اسے کہنا کہ ندی اپنا رستہ خود بناتی ہے
اسے کہنا
کسی اندیشہ موہوم کی خاطر
چمکتا لمحہ موجود پس انداز کرلینا
کسی سیماب جذبے کی کبھی خواہش نہیں ہوتی
اسے کہنا
مہکتے آنگنوں میں سوکھتی بیلوں کی گنجائش نہیں ہوتی
اسے کہنا
کسے معلوم اگلے سال کے سورج کی حدت سے
کہاں پر برف پگھلے گی
سبک رو ندیاں چل کر کہاں دریا بنیں گی
اور کہاں سیلاب آئے گا
اسے کہنا

کلیم ظفر

یافت

آج نگاہیں اچانک اس کے بالوں پر جا ٹکیں
سیاہ لمبے چمکیلے گھنے بال
جانے کیوں مجھے اک خوبصورت گھوڑے کا خیال آیا
اور پھر
مجھے ایسا لگا جیسے
سرزمیں دل پہ طلوع ہونے والے
عشق کے سورج کو ساتواں گھوڑا مل گیا ہے

گفتار خیالی

دو زاویے

یہ شام زمستاں میں ٹھٹھرتے ہوئے چند
نازک بدن!
جن کے چہروں پہ بے جان بوسوں کے ان مٹ نشاں
فائیو اسٹار ہوٹل کی زینت بنے ہیں
ادھر ایک بیرے کا بے آب لہجہ
ادھر گاہکوں کی یہ بھوکی نگاہیں
کہ محسوس ہوتا ہے دونوں طرف سے
یہ سودا تو پہلے سے طے ہو چکا تھا
میں حیراں ہوں انسان کی مفلسی بھی
کہاں سے کہاں لے کے پہنچی ہوئی ہے
یہ بیرا جو ٹپ کے لئے سر خمیدہ
سنے برتنوں کو سمیٹے۔ کھنگالے
وہ چہرہ ضرورت سے مغلوب ہو کر
جو عصمت کے ہوٹل میں موتی اچھالے
طلب ایک عندالطلب ہے
اور مطلب براری کے دو زاویے

گوہر زیدی

نظم

ایک لمحہ ابھی ابھی آیا
ایک لمحہ تھا جو گزر بھی گیا
آنکھ کھولی تو بس یہی دیکھا
جی رہا ہوں میں اور مر بھی گیا
جو نہ ہونا تھا ہو گیا وہ بھی
اور جو ہو گیا ہوا بھی نہیں
آج تک جس کا لمس تازہ ہے
سچ تو یہ ہے کہ اسے چھوا بھی نہیں
کل جو مجھ سے ملا تھا میں ہی تھا
آج جو مل رہا ہے میں ہی ہوں
مجھ سے مجھ تک کی اس مسافت میں
مجھ سے جو کھو گیا ہے میں ہی ہوں
خامشی خامشی ہے آہ و بکا
کیف در کیف اک اذیت ہے
ہوش سے ہوش تک ہے بے ہوشی
خواب سے خواب تک حقیقت ہے

محسن احسان

موت کے لئے دعا

پرانے سے اخبار میں وہ
گلابوں کا دستہ اٹھائے ہوئے
تیز رفتار سے جا رہی تھی
نہ سر پر دوپٹہ
نہ پاؤں میں جوتے
نہ ہونٹوں پہ سرخی
نہ آنکھوں میں کاجل
نہ چہرے پہ غازہ
مگر سب کے سب پھول تھے
اس پرانے سے اخبار میں
نور صبح گلستاں کی مانند تازہ
وہ اک قبر کے سامنے یوں کھڑی تھی
کہ دیوار پر
جیسے تصویر کوئی جڑی تھی
عجیب سوندھی سوندھی سی خوشبو
ہر اک سمت
مٹی کے اس ڈھیر سے اٹھ رہی تھی
پرانے سے اخبار سے
پھول اس نے نکالے
تو ہر سمت مہکے
محبت کے دل دوز نشے

رفاقت کے نامہرباں کرب افزا اجالے
پھر اس کے لبوں پر
یہ الفاظ اس طرح بکھرے
کہ جیسے ہواؤں میں روئی کے گالے
"زمانوں کے مالک
جہانوں کے آقا
تیری قہرمانی کے صدقے، مجھے اس جہاں سے اٹھا لے"

رابرٹ فراسٹ / محمد افسر ساجد

آگ اور برف

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کی فنا آتش ہے
کچھ یہ کہتے ہیں کہ یخ بستہ ہے انجام اس کا
مجھ کو معلوم ہے خواہش مری کیا چاہتی ہے
کہ چلوں ساتھ میں آتش کے طرفداروں کے
ہاں اگر ہو یہ فنا دوسری بار
تو یہ جانوں کہ شناسا ہوں میں
نفرت کا بہت
اور پھر یہ کہ خرابے کے لئے
برف کا سیل رواں
نیز بہت کافی بھی

یاد

مرا دل چاہتا تھا
تم سے ملنے کو
مگر سچ ہے
کہوں کیا جو
مجھے محسوس ہوتا ہے
تمہارے پاس رہ کر ہی
تمہی سے دور رہتا ہوں
سبھی کچھ بھول جاتا ہوں
مگر اب یاں
نگار جاں میں اے ہمدم
فقط اک یاد باقی ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

رشتہ گونگے سفر کا

جنون و خرد کا تعلق
جسے لوگ کہتے ہیں
رشتہ ہے گونگے سفر کا
ازل سے یہ رشتہ چلا آ رہا ہے
جسے ہم سبھی جانتے ہیں
مگر منزلِ شوق پر
دو قدم چل کے تھک بیٹھنے کے سوا
ہم نے جانا ہی کیا تھا
یہ عشق و جنوں کا کوئی کھیل
ہرگز نہیں ہے
مگر تم ایسے میں
فن کے نئے گلستاں میں
حسیں گل کھلائے
بہاروں کی رفعت کو بخشی ہے
تم نے ہنسی
حسن کی دلکشی
گریہ بے کسی
زلف کی برہمی
پھول کی پنکھڑی
عالمِ بے خودی
مسلکِ بندگی

محمد مشتاق آثم

معمول

جبر کے سارے جگراتے جب میری پلکوں پہ جلنے لگے
دشت بے آس کی وسعتوں میں سبھی درد کے قافلے راہ
کھونے لگے
شب سیاہی تلک بھی سوا ہو گئی
تنگ نظر طاقتوں نے میری تیرتی خواہشوں کی سبھی
کشتیوں کو تہہ آب کر بھی دیا
وقت کی ایک بے نام وقعت میں جب واقعے وقف کرنے
لگے
تب اسی ثانیے میری تہذیب اور میرا سارا تمدن تباہ ہو گیا
میں کہ ثقلِ ساعت کا مارا ہوا
اک صدائے ثمر کی تمنا لئے
روشنی سے تہی ایک سونی سیہ رات کی سیج پر سو گیا
صبح دم پھر صبا نے صدا دی مجھے
اک نئے دن نے پھر ماں کی صورت بلایا' بلائیں بھی لیں
میرا بوسہ لیا
تازگی میرے تن کی تہوں میں اترتی گئی
صبح صادق کے زمیدہ آثار تھے
گھاس پر شبنمی اوس سے کھیلتی تھی کنواری کرن
میں اٹھائے کفن
جانب کارخانہ تھا محوِ سفر

مقسط ندیم

خطاب

اداس آنکھیں یہ زرد چہرہ
مرے تصور کی دلکشی سے، مرے ہی لفظوں کی نغمگی سے
کہا گیا کہ حسیں ہوئے ہیں
جو میں نہ ہوتا تو کون کہتا کہ مہ جبیں ہو
شعور تم کو یہ کون دیتا کہ مہ جبیں ہو
میں آئینہ تھا
میں آئینہ تھا
کہ مری ساری شبیں تم میں چھپی ہوئی تھیں
بدن کے جتنے بھی زاویے ہیں مری نظر سے خراج لے کر
حسیں ہوئے ہیں
تمہارے جتنے نشیب ہوتے میں ان کو ایسے معانی دیتا
کہ لوگ ان کو فراز کہتے
تمہارے لمحہ دید کو سب نماز کہتے
مگر تمہاری یہ کم نصیبی کہ تم نے مجھ کو گنوا دیا ہے
وہی خزانہ جو مشکلوں سے
تھا ہاتھ آیا گنوا دیا ہے

محمد سلیم شہزاد

ضرورت جوڑ دیتی ہے

ہم خود نہیں جڑتے
ضرورت جوڑ دیتی ہے
اور کبھی مجبوری کے پاؤں پہ
خود سے جڑنا پڑتا ہے
کہ احتیاج کی لو
کبھی تیز کبھی مدہم
کبھی مدہم کبھی تیز ہو جاتی ہے
ہم انکار کے انگاروں پر
چل نہیں سکتے
محبت ہار جاتے ہیں

میاں شان احمد

سویرا

ارے او غمزدہ لوگو
ارے بولو، تمہیں بولو
تعارف سے 'یا بن جانے ہی' کہہ ڈالو
تمہارے خواب کیسے تھے
تمہارے خواب کیسے ہیں
جنہیں تعبیر کی حسرت
بکھرنے ہی نہیں دیتی
کہ اس کو زعم ہے
بے داغ اک روشن سویرے کا
کہ جس کی آس میں تارے
نویدوں اور امیدوں کی باراتیں
لئے ہر شب
کسی سستم، کسی مرد قلندر کا پتہ دینے
تمہارے پاس سے کچھ یوں گزرتے ہیں
کہ شائد وہ تمہارے ان حسیں خوابوں کو
پھر اک بار
انجانی مسرت، اک نئی تعمیر کی حسرت سے
لذت آشنا کردیں

ناجیہ مبارک

امکان کا سفر

میں نے اپنے آنگن میں درد کے کانٹے بوئے ہیں
وحشتوں کے چراغ جلائے ہیں
آسمانوں سے اترنے والی وحی سے اب خوف آتا ہے
کہ فرشتے نامعلوم اب کیا پیغام لائے ہیں
خاموش اونچے پہاڑوں کی گواہی ہے
کہ سائے اب پرائے ہیں
کچھ پھول خوشبو کے مقتل میں آئے ہیں
اک خوفناک سناٹا ہے
جس نے آواز کے طوفان کو سمیٹا ہوا ہے
سب کچھ سامنے ہے مگر اوجھل ہے
میں نے اپنی سماعتوں پر پہرے بٹھائے ہیں
میں نے اپنے خواب جنگل میں گنوائے ہیں
وہ اک لمحہ کہ جس کے بعد دامن خالی تھا
اب تو غم بھی پرایا ہو اکہ
اپنا گھر ہی سوالی تھا
اب مداوا کیوں کر ہو
جنونی لوگوں کے قافلے میں کچھ لوگ باہر سے آئے ہیں
اپنا اسباب جو گمان کی راہوں میں کھو آئے ہیں

ناصر زیدی

ایک نظم

وہ ایک حرف جسے حرف آشنا کہیئے
وہ ایک لفظ جسے لفظ نارسا کہیئے
وہ ایک گل جسے نادیدہ قضا کہیئے
یہی ہے دل کا تقاضا اسے خدا کہیئے

کسی حسین مصور کا شاہکار ازل
نہ کوئی پیکر ثانی نہ کوئی اس کا بدل
وہ رنگ و نور کی صورت میں ایک تاج محل
زبان شعر میں غالب کی بے مثال غزل

صبا میں مستی و موج خرام اس سے ہے
خزاں بغیر چمن کو دوام اس سے ہے
مری یہ شوخی طرز کلام اس سے ہے
سخنوری میں نمایاں مقام اس سے ہے

نیا عہد نامہ

تم کیوں سوچو
ایسی باتیں
میں ہر اک سے کہتا ہوں گا
تم ہو، میرے من کی رانی
کب تم جیسا کوئی دیکھا
تم سے یہ اقرار ہے میرا
مرتے دم تک پیار کروں گا

تنہا اداس لڑکی

بند کمرے میں سانولی لڑکی
اپنی تنہائیاں سمیٹے ہوئے
سوچ کے دائروں میں گم صم ہے

ناصر کریم

اے مرے چارہ گر

لفظ پتلے نہیں اے مرے چارہ گر
جن کو آواز کی ڈور سے باندھ کر
تو نچاتا رہے
اور میں تکتا رہوں
بے خودی سے تری شعبدہ بازیاں
اے مرے چارہ گر
میں طلسم سماعت کا قائل نہیں
یہ پس صوت معنی کی جادوگری
مجھ کو مبہوت کرنے کو کافی نہیں
اے مرے چارہ گر
دست نطق ریا کے تراشے ہوئے
کہنہ اصنام ٹوٹیں تو کچھ بات ہے
لفظ جذبوں سے پھوٹیں تو کچھ بات ہے

وقت کس کا ہوا

وقت نابود لمحوں کی گٹھڑی کمر پر اٹھائے ہوئے
شب کے برگد تلے
قرن ہا قرن سے
اپنی میلی مسافت کی چادر پہ چپ چاپ بیٹھا ہوا
حسرتوں کے لہو میں بھگوئے ہوئے ریگتی دھڑکنیں
اور سانسوں کی مٹی میں تیرہ شبی گوندھ کر
عمر کے چاک پر
زندگی کے کھلونے بناتا ہوا
درد کی بھٹیوں میں پکا کر
انہیں خود مٹاتا ہوا
وقت کس کا ہوا؟

زندگی ہے کہ دشنام ہے

ذہن ہے یا بھکاری کا کشکول ہے
شاعری جس میں بوسیدہ سکوں کی صورت
پڑی رہتی ہے
عمر ہے یا خرابات کی شام ہے
زندگی ہے کہ دشنام ہے

نسرین انجم بھٹی

باتیں کرتے کرتے

روٹھے ہوئے جنگل کی ایک شاخ ہی کافی ہے
محبت کی ایک نسل کو نفرت کی دو نسلیں پیچھے لے جانے
کے لئے
مال گاڑی کہیں سے نہیں آئے گی کہیں جانے کے لئے
اور
ایک اور جنگل کٹ جائے گا
ایک اور نسل بے نسل رہ جائے گی محبت کے باب میں
آہستہ آہستہ نہیں
کھٹا کھٹ۔ ہاتھ سر اور کلیجے کٹ کٹ کر
ایک فوڈ فیکٹری کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں
آس پاس اتنے گھنے دکھ ہیں
کہ سکھ کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
بارش کے پھول اور جنگل کی آوازیں کہاں رہ گئیں
چولہا پھٹنے، گھر جلنے اور دل بجھنے کے موسم تک
چیونٹی اور چنار کو ہم نے آگ سے ناپا
اور بھری برسات والے ہمارے دن چھوٹے
اور راتیں لمبی کرتے چلے گئے
جب جسم کا پہناوا چوٹ ہوا
تو ٹانکے لگنے اور ادھڑنے میں ایک ٹانکہ کم رہ گیا
یوں میں اپنی لہر سے بچھڑ گئی اور ٹانکا لگانے والا اپنے
حساب سے

اور مجھے اپنا حرف مبارک نہ ہوا
لوٹ آ اول گہ آشنائی! پنجرے میں پنچھی کی طرح
، تاکہ میں دروازہ بند کرلوں
اور اس سے باتیں کرتے کرتے سو جاؤں
اڑنے والے کیڑوں کی طرح ہمیں ایک رات کے لئے
پر ملیں
مگر ہم نہ اڑیں
سو رہیں --- باتیں کرتے کرتے

نسرین انجم بھٹی

ساون کا ایک دن بھادوں کی ایک شام

بارش کے دنوں پر یقین رکھنے والو!
یقین رکھو کہ میں نے دل دکھن سے
اور آنکھیں آنسوؤں سے اس لئے بھر لی ہیں
کہ وہ موتی چگتا ہے
کوئی دکھ جو موتی بننے کے عمل سے آنسوؤں کی راہ سے
گزرے تو.....
بارش کے دنوں پر یقین رکھنے والو
جب پرندے پیاس کی تاب نہ لاکر بادلوں کا تعاقب
کرتے ہیں
تو کوئی آنکھ کیوں بھر نہیں آتی
خالی آنکھوں کے پیالے کیا جان کر خالی رہے
بارش کے دنوں پر پھر بھی یقین رکھنے والو
میرے تلوؤں کا لہو میری آنکھوں میں سوکھ گیا
میں نے جس کو زبان دی تھی
وہ اسے آواز کا رس کب دے گا؟
وادی کی سب آوازیں خاموش ہیں
اک تیری آس کے دھیان میں
اک تیری آواز کی لگن میں میں مہندی کا درخت بن گئی
درختوں میں سب سے بے بس

اور موسموں میں سب سے عجیب، آگ تراشتی شام
کونسا بھید چھپائے گی
کونسا بتائے گی۔۔۔ہاں! بارش کے دنوں پر یقین رکھنے
والو......

نصیر احمد ناصر

کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے

کیا تم خاموشی سن سکتی ہو؟
میں نے تنہائی کو چلتے دیکھا ہے
سوکھے پتوں کی طرح چر مر خوابوں کے
رستوں پر!
کچھ منظر آنکھوں کے پیچھے ہوتے ہیں
جن کو عدسے دیکھ نہیں سکتے
جو تحریر نہیں ہو پاتے
وہ کس عہد کا قصہ بنتے ہیں؟
اور دلوں پر کندہ خواہش کی شکلیں
کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے!
عورت اور خدا میں یکتائی کا رشتہ ہے
بے اشک اداسی کے انت سرے پر
جب تم دکھ سے ہنستی ہو تو
میرے ساتھ خدا بھی رونے لگتا ہے
کیا تم اپنے لمس میں بھیگی بکھری نظمیں
بادل اور ہوا کے پرزوں پر لکھ سکتی ہو؟
بارش کے موسم میں
آنسو گننا کتنا مشکل ہوتا ہے
جس مٹی سے تم لفظ بناتی ہو
وہ میری روح کا اترن ہے
میں نے اپنے جسم میں جینا چھوڑ دیا ہے!

میں تم کو یاد نہیں کر سکتا

تم خواب ہو
اور میں تنہائی
میرے دل کے افق سے
سورج روز نکلتا ہے
اور تمہاری آنکھوں میں ڈھل جاتا ہے
نیندوں کے جنگل میں
میں تمہاری جانب جاتے رستوں پر
چلتے چلتے تھک جاتا ہوں
چاند تمہارے جسم کی سولی پر لٹکا
آدھی شب کے دو نیم اندھیروں میں
دکھ کا پیلا سمبل ہے
رات تمہاری زلفوں سے اتر کر
رانوں تک آجاتی ہے
پھر بھی صبح نہیں ہوتی
اک لمسیدہ پرچھائیں کو چھونے کی خواہش میں
ساری عمر سلیٹی ہو جاتی ہے
وہ میرے دل میں نہیں آتا
میرے ہاتھ لکیروں سے خالی ہیں
میں تم کو یاد نہیں کر سکتا
اترائی کا سفر بھی مشکل ہوتا ہے!

نصیرالدین شیخ

مسلسل

شیشم کا اک کومل پودا
اپنے کھیت کے اک کونے میں
آج جو میں نے بویا ہے
آنے والی رت میں شاید
اک دن اس کی چھاؤں میں
اپنا پسینہ خشک کروں گا
یا پھر میرے بچے اس کے
سائے تلے سستائیں گے
پھر کیا ان کو یاد رہے گا؟
ان کے بابا ہی نے اس کو
جلتی دھوپ میں بویا تھا
اور اپنے اسلاف کو اس پر یاد کیا تھا
اس پتھر کے ناطے سے
جس نے ننھے شیشم کے پودے کو
گرنے سے محفوظ کیا تھا
ہو سکتا ہے صدیوں پہلے
دور دکھائی دینے والی
غار کا یہ بھی حصہ ہو
جس میں میرے جد امجد
ان دنوں بسیرا کرتے تھے

نفی

زندگی کے اس کنارے سے کبھی
دیکھنا منظر یہ منظر
گر دکھائی دیں تمہیں
اس جہاں کی کلفتیں' دشواریاں
آرزوئیں' خواہشیں' محرومیاں
مسندیں' سرداریاں
یوں نظر آتی ہیں جیسے
بہتے پانی میں خس و خاشاک ہوں

نوید مرزا

کون مصروف دعا ہے

کون مصروف دعا ہے
آسماں کی چھت پہ لگتا ہے
دراڑیں پڑ گئی ہیں
اور زمیں شق ہو گئی ہے
جنگ کے میدان میں لڑتے ہوئے بیٹے
صدائیں دے رہے ہیں
ماں!
ابھی آنکھوں میں جلنے دو
امیدوں کے چراغوں کو
ابھی بازو کٹے ہیں
پاؤں چھلنی ہو گئے ہیں
سر بریدہ ہیں
مگر آنکھیں سلامت ہیں
ابھی زندہ ہیں ہم
زندہ رہیں گے ہم

اذیت

جب کوئی چھوڑ کر چلا جائے
عمر بھر ہجر کی اذیت میں
چیونٹیاں رینگتی ہیں سینے پر

تضاد

اس کے رخ پر تھی کفر کی عینک
پڑھ رہا تھا کتاب نعتوں کی

STATEMENT

محبت کا اگر آغاز کرنا ہو
تو پہلے ایسا کر لینا
کسی ویران سے گوشے کی
تنہائی میں گھر لینا

EXTREME

جب ہم باتیں کرتے کرتے
تھک جاتے ہیں
لفظوں کو آنکھوں کے اندر
رکھ دیتے ہیں

نیناجوگن

ایقان

میں جانتی ہوں کے اب
تمہاری ناراضگی
میرے دروازے پر
دستک نہیں دے گی
مگر تم اب بھی
زندہ ہو
مٹی میں
پانی میں
نہ کبھی بجھنے والی آگ میں
کون کہتا ہے کہ اب تم نہیں ہو
جن کے دل جم کر برف بن گئے تھے
ان کے برفیلے دل میں
آگ پیدا کی ہے تم نے
اور یہ آگ
پھیلی ہے مگر چورا ہے پر
تم نے ہی آدمی کو
آدمی کی طرح جینے کے لئے سکھایا تھا
تم نے ہی ہمیں جگایا ہے
کون کہتا ہے کہ اب تم نہیں ہو

گمشدہ چہرے کے بیچ

ہر ایک چہرے پہ
اک نقاب وفا ہے لیکن
وفا کہاں ہے ؟
یہ لوگ ہنستے ہیں لیکن ان کی ہنسی میں
رنگ طرب نہیں ہے
یہ کھوکھلے چہرے جن کی نظریں
فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں
بس اک گھنی تیرگی ہے
کوئی کرن نہیں ہے کہ جگمگائے
میں خود کو اس جمگھٹے میں
گم کرتی جا رہی ہوں!

وحید احمد

مجھے اب اور نہ سینا

وہ تیزی سے ادھڑتا جا رہا تھا
ہر اک دن اس کے بخیوں سے الجھ کر رات ہو جاتا
وہ روزانہ
بساطِ روز و شب پر سانس کے مہرے چلا کر مات ہو جاتا
وہ سینہ کھول دیتا اور گہری سوچ میں رہتا
یہ سینہ ہے کہ تجریدی مصور کی کوئی تصویر ہے
جس کے ادھڑ کتے کینوس پر بال بکھرائے لکیریں چیختی ہیں
اور نقطے بین کرتے ہیں
یہ گھاؤ میرے اپنے خون نے مجھ پر لگایا تھا
مرے بھائی، جنہیں مجھ سے زیادہ باپ کی جاگیر پیاری تھی
یکایک پاس آئے
اور مجھ کو چیر کے دو لخت کر ڈالا
مری ماں نے مجھے جوڑا
پھر اپنے بازوؤں کے نرم سٹریچر پہ رکھا
اور اپنے آنسوؤں کا تار دوہرا کر مجھے بخیہ لگایا تھا
یہ پھٹ اس چوٹ کا ہے جو زمانے نے لگائی تھی
میں جب تعلیم سے فارغ ہوا
تو میرے دونوں ہاتھ سورج کی طرح چمکار دیتے تھے
بڑے لوگوں کے لو دیتے ہوئے اقوال روشن تھے
عقیدے کی چمک دیتی ہوئی قندیل جلتی تھی
مگر مجھ پر کھلا
کہ دو جہاں اک دوسرے سے مختلف ہیں
اور ان کے درمیاں مکتب کا پھاٹک ہے
مجھے مکتب نے روکا تو زمانے نے مجھے کھینچا
نتیجتاً میں ٹوٹا
اور پھر علم و عمل کی ملگجی سرحد پہ گر کے پارہ پارہ ہو گیا

پھر وقت نے ہاتھوں میں سوزن لی
زمیں کے گھومتے گولے سے اک دھاگہ نکالا اور سینے
لگ گیا
اس نے مرے اور اک کو باریک ٹانکے سے سیا
وجدان کے ایک ایک روزن پہ رفو کاڑھا
بلا کا بخیہ گر ہے وقت، آفت کار فو گر ہے
وہ سیتا بھی ہے، سمجھاتا بھی ہے
او بے خبر، دیکھو
یہ دنیا درمیانی ذہنیت کے، مصلحت جو، کند لوگوں کے
لئے پیدا ہوئی ہے
یہاں حساس ہونا ایک ایسا جرم ہے
جس کی سزا کوئی نہیں دیتا
بس اپنے آپ ملتی ہے
ذرا احساس کو تم آبگینے کی طرح دہلیز پر رکھو
تمہیں معلوم ہو جائے گا
پامالی کسے کہتے ہیں
کیونکہ لوگ ریوڑ کی طرح پاؤں سے چلتے ہیں
نگاہوں سے نہیں چلتے
وہ سینہ کھول دیتا اور گہری سوچ میں رہتا
مرا احساس چکنا چور ہے پھر بھی چمکتا ہے
مرے سینے کے سب ٹانکے کھنچے ریشوں کے ہاتھوں سے
پھسلتے جا رہے ہیں
مجھے اب اور نہ سینا۔
میرا سینہ نہ سینا،
اب تو اس میں سانس بھرنے کی جگہ باقی نہیں
ٹانکا بھلا کیسے بھرا جائے۔

وحید احمد

ہم شاعر ہوتے ہیں

ہم پیدا کرتے ہیں
ہم گیلی مٹی کو مٹھی میں بھینچا کرتے ہیں
تو شکلیں بنتی ہیں
ہم ان کی چونچیں کھول کے سانسیں پھونکا کرتے ہیں
جو مٹی تھے، وہ چھو لینے سے طائر ہوتے ہیں
ہم شاعر ہوتے ہیں
کنعان میں رہتے ہیں
جب جلوہ کرتے ہیں
تو ششدر انگشتوں کو پوریں نشتر دیتی ہیں
پھر خون ٹپکتا ہے
جو سرد نہیں ہوتا
اک سہاسا سکتہ ہوتا ہے
درد نہیں ہوتا
یونان کے ڈاکو ہیں
ہم دیوتاؤں کے محل میں نقب لگایا کرتے ہیں
ہم آسمان کا نیلا شہ دروازہ توڑتے ہیں
ہم آگ چراتے ہیں
تو اس دنیا کی بخ چوٹی سے برف پگھلتی ہے
پھر جمے ہوئے سینے ہلتے ہیں۔ سانس ہمکتی ہے
پھر شریانوں کے منہ کھلتے ہیں
خون دھڑکتا ہے
جیون راماین میں

جب راون استبدادی کاروبار چلاتا ہے
ہم سیتا لکھتے ہیں
جب رتھ کے پہیے جسموں کے خاشاک کچلتے ہیں
تو گیتا لکھتے ہیں
جب ہونٹوں کے سہمے کپڑوں پر بخیہ ہوتا ہے
ہم بولا کرتے ہیں
جب منڈی سے ایک ایک ترازو غائب ہوتا ہے
تو جیون کو میزان پہ رکھ کر تولا کرتے ہیں
مزدوری کرتے ہیں
ہم لفظوں کے جنگل سے لکڑی کاٹا کرتے ہیں
ہم ارکشی کے ماہر ہیں، انبار لگاتے ہیں
پھر رندہ پھیرتے ہیں، پھر برما دیتے ہیں
پھر بدھ ملاتے ہیں، پھر چول بٹھاتے ہیں
ہم تھوڑے تھوڑے ہیں
اس بھری بھرائی دنیا میں ہم کم کم ہوتے ہیں
جب شہر میں جنگل در آئے
اور اس کا چلن جنگلائے
تو ہم غار سے آتے ہیں
جب جنگل شہر کی زد میں ہو
اور اس کا سکوں شہرائے
تو برگد سے نکلتے ہیں
ہم تھوڑے تھوڑے ہیں، ہم کم کم ہوتے ہیں

وزیر آغا

جرسی

اون کے شانت سمندر کے اندر جب
نازک مخروطی پوروں نے
جھانکا
تہ میں اتر کر
لاکھوں برسوں پر طاری بے انت سمادھی کو توڑا
تو رنگوں کا اک فوارہ بیدار ہوا
اون کے دلکش دھاگوں میں کہرام مچا
سرخ، عنابی، زرد، قرمزی
دھاگوں کی صد ہا لہروں نے
پوروں کے شیو ناچ میں مل کر رقص کیا
رقص کیا۔ پر تیری مخروطی پوروں نے
کس ممتا سے کنگھی کر کے
سب گرہوں سب "الجھنوں" کو ہموار کیا!
اور اب اون کی برہم موجیں
شانت پڑی ہیں
گرہوں اور حلقوں میں بٹ کر
جرسی کے بے داغ بدن پر نقش ہوئی ہیں
قوس قزح کا عکس بنی ہیں
نازک مخروطی پوروں نے
اون کا اک "منظر" سا بنا ہے
کس ممتا سے
[illegible] مواج سمندر کو ہموار کیا ہے!!

لگتا ہے اب بارش ہو گی

لگتا ہے اب بارش ہو گی
دھان کے سوکھے کھیتوں پر
سب خاک اڑاتے رستوں پر
جو قدموں میں پامال ہوئے ہیں
دھوپ کی میلی چادر اوڑھے
جن کو لاکھوں سال ہوئے ہیں
لگتا ہے اب بارش ہو گی

لگتا ہے اب بارش ہو گی
تنکا تنکا پلکوں پر
پلکوں سے چپٹے خوابوں پر
خوابوں میں بند جزیروں پر
سب خالی دودھ کٹوروں پر
سب بچوں پر
سب سوکھے پیاسے ہونٹوں پر
سب پانی کے رکھوالوں پر
اور سیس کٹانے والوں پر
اب بارش ہو گی
لگتا ہے اب بارش ہو گی!!

اشرف سلیم

صبح صادق کے رستے میں پڑی نظم

میں نے اس چہرے کو اوڑھا
جس نے تیرے جسم کی مٹی
اپنے ہاتھوں گوندھی
جس نے تیرے عکس بنائے
جس نے تیرے نقش بنائے
لیکن اب تو
اپنے جسم کو اوڑھنی دے کر
میری آنکھوں سے کیونکر یہ عکس چھپائے؟
مرے ہاتھوں نقش بچائے
دیکھو میں نے
اس چہرے کو اوڑھا
جس نے
ہم دونوں کی مٹی گوندھی

ڈاکٹر افضال ملک

دعا

چلے چلو!
ہوا بھی کیا---؟
جو کارواں کا
دور دور تک نہیں
کوئی نشاں---
مری دعا یہی ہے کہ
صراط مستقیم کے
تمام واسطوں پہ تم
بساط جاں بچھا کے
اپنے راستوں پہ تم
سفر کو جاری رکھ سکو
تم اپنے پاؤں کے
ہر ایک چھالے کی
چبھن کا درد
چکھ سکو
کہ اپنے حوصلوں کو خود
پرکھ سکو!!!

ارشد لطیف

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل

حسن و عشق
ہم قدم
دو قدم راستہ
راستے کے درمیان
اک پہاڑ
اس کے پار کیا ہے یہ
مجھ کو بھی خبر نہیں
مگر مرا خیال ہے
ادھر ہے جو ادھر نہیں

آغا نثار

ناممکن

کاش کبھی محسوس کرو
کاش کبھی تم دیکھ سکو
آگ جو دل میں دہکی ہے
شور جو میری چپ میں ہے
کاش کہ تم محسوس کرو
اور وہ آگ بھی دیکھ سکو
لیکن ایسا ہونا کیونکر ممکن تھا
تم اک پتھر تھے
ہر احساس سے عاری پتھر
نیلی نیلی آنکھوں والے
بولتے پتھر تھے

آغا نثار

دیکھنا سب خواب میرے دیکھنا

ٹوٹتا ہے شب کی ظلمت کا غرور
پھوٹتے ہی صبح کی پہلی کرن
جس طرح ننھی سی چڑیا کی چہک
گونج اٹھی خامشی کے دشت میں
اور برف بے حسی کو توڑ کر
منجمد لمحات کے پانی سے وہ
اک نئی دنیا کو دے دے گی جنم
قمریوں کا غول جس ماحول میں
ایک نغمے کی اداسی کی طرح
چاروں جانب پر کشا ہو جائے گا
دیکھنا تم خواب میرے دیکھنا
ایک دن تعبیر میں ڈھل جائیں گے
مہر و مہتاب و زمین و آسماں
ریگ صحرا کی طرح مل جائیں گے

دوری

اپنے اپنے گھر میں بیٹھے
اک دوجے کو سوچ رہے ہیں
اپنے اپنے ویرانے میں
کھوج رہے ہیں
کوئی سبب اس دوری کا

ابھی کچھ فیصلہ کرلیں

ابھی میں سوچ سکتا ہوں
ابھی تم سوچ سکتی ہو
ابھی بے لوث چاہت ہے
ابھی جذبات بچے ہیں
سبق پہلا ورق پہلا
ابھی کچھ فیصلہ کرلیں
ابھی تم لوٹ سکتی ہو
ابھی میں لوٹ سکتا ہوں
ابھی ہم لوگ بچے ہیں
ابھی ہم لوگ کچے ہیں

اسے اپنا بنالیا

بنے محور جو سوچوں کا
لگے جو باوفا تجھ کو
جسے دیکھے سے آنکھوں کو
ملے ٹھنڈک سکوں دل کو
اسے اپنا بنا لینا
مجھے سپنا سمجھ کر تم
سنا دینا بھلا دینا

باقر مہدی

جدائی کا آخری لمحہ

آخری بار تم سے مل کر بھی۔ جانے کیوں؟
دل کی دھڑکن رکی رکی سی رہی
آہ ہونٹوں تک آ نہیں پائی
باتیں کیا کرتے۔ گزرے لمحوں کی
اک تبسم بھی کام آ نہ سکا.........
اس قدر ہم ڈرے ڈرے سے تھے
تم سے نظریں بھی ہم ملا نہ سکے
قحط اور فساد کے قصے
بمبئی ہی نہیں.......... ہر ایک جگہ
فرقے فرقے میں جنگ ہوتی ہے
اور کتنے تباہ ملکوں میں
ہر طرف شور، خون اور قحط
ہم کوئی اور بات کر نہ سکے
خامشی کیسے دوست بن بیٹھی؟
اور جدائی کا آخری لمحہ
ہم کو حیرت سے دیکھتا رہا

ایک فاتح کی شہادت ، کبھی پہلے تو نہ تھی!
سرکشی کی یہ روایت ، کبھی پہلے تو نہ تھی!

خامشی ساتھ لگی رہتی تھی ہر منزل پر
بول اٹھنے کی جسارت ، کبھی پہلے تو نہ کی تھی!

دیکھ رہ رہ کے دھواں اٹھتا ہے شہروں شہروں
کوچے کوچے میں بغاوت ، کبھی پہلے تو نہ تھی

قتل ہونے پہ کمر بستہ ہیں سارے بے کس
موت سے اتنی رفاقت ، کبھی پہلے تو نہ تھی

تلخ سے تلخ ہوئی جاتی ہیں تیری باتیں
سچ کہیں ، ایسی صداقت ، کبھی پہلے تو نہ تھی

زلزلے آتے تھے مر جاتے تھے لاکھوں لیکن
ساری دنیا میں قیامت ، کبھی پہلے تو نہ تھی

کیسے اشعار میں ڈھل جاتا ہے سارا لاوا؟
تجھ میں باقر یہ مہارت ، کبھی پہلے تو نہ تھی

حمایت علی شاعر

اک پیکر جمال ابھی تک نظر میں ہے
محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ گھر میں ہے

اک روشنی سی پھیلی ہوئی ہے درون دل
اک کہکشاں سی بکھری ہوئی چشم تر میں ہے

اک عالم سکوت ہے ایسا کہ یوں لگے
اک تشنگی سی جاگی ہوئی بام و در میں ہے

وہ تو چلا گیا مگر اس کے وجود کی
خوشبو بسی ہوئی مرے شام و سحر میں ہے

یہ واہمہ یا کہ حقیقت' خبر' نہیں
میں اس کا ہم سفر ہوں وہ جس رہگذر میں ہے

رشمی بادشاہ

دل کا زخم تو سینا ہو گا
ہنستے ہنستے جینا ہو گا

مجھ کو میرا حق دلوا دے
کس کا اتنا سینا ہو گا

چلتی پھرتی لاش بنی ہوں
سانس لئے بن جینا ہو گا

جس نے میرے درد چھپائے
جھوٹا وہ آئینہ ہو گا

پیار نظر نہیں آیا جس کو
وہ کوئی نابینا ہو گا

تو سقراط بنے یا عاشق
تجھ کو زہر تو پینا ہو گا

بد اخلاقی سے سمجھوتا
نہیں یہ ہم سے کبھی نا ہو گا

آنکھ انگوٹھی ہے تو رشمی
آنسو ایک نگینہ ہو گا

پیغام

اظہر جاوید

ابھی فون کی ایک گھنٹی بجی تھی
بہت مضطرب ہو کے چونکا اٹھایا
بہت شوق سے میں نے حسب روایت
"جی۔ اظہر" کہا تھا
مگر اس طرف خامشی چھا رہی تھی
صدا سانس کی تھی نہ اس کی مہک تھی
نہ اس کے تکلم کی کوئی کھنک تھی
نہ لہجے کا کوئی ترنم ملا تھا
نہ ہونٹوں کا کوئی تبسم کھلا تھا
فقط ریڈیو کی صدا آ رہی تھی
لتا داستان الم گا رہی تھی
"نہ تم بے وفا ہو، نہ ہم بے وفا ہیں
مگر کیا کریں اپنی راہیں جدا ہیں"

سلیم شاہد

مسافران جنوں جو قدم اٹھاتے ہیں
یہ ٹھان کر کہ چلو بار غم اٹھاتے ہیں

بچا کے رکھے ہیں آنکھوں میں آفتاب کئی
یہ مشغلہ ہے کہ شعلوں سے نم اٹھاتے ہیں

نہیں سرشت میں آرائی خیال سی شے
وہ جنس ہیں جو خریدار کم اٹھاتے ہیں

ہنر نہ آیا ہمیں قافلہ بنانے کا
ہم اپنے ہاتھ میں اپنا علم اٹھاتے ہیں

مقابلہ ہے کہ دل ناتواں کا وحشت سے
گراں بہت ہے یہ پتھر پہ ہم اٹھاتے ہیں

بس ایک فرصت مرہم کہ زخم رستے ہیں
سفر میں ہم نہیں غافل قسم اٹھاتے ہیں

اک آدھ ہاتھ دور خزانے دھرے رہے
جو خواب دیکھنے تھے سرہانے دھرے رہے

کس کو ہجوم حال میں تھی فکر رفتگاں
دانست میں وہ گزرے زمانے دھرے رہے

ٹھہری ہوئی نشست پہ آنکھیں جمی رہیں
کیا کیا تنی کماں پہ نشانے دھرے رہے

سب آشنائیاں تھی سفر میں قیام تک
جب چلے پڑے تو سارے ٹھکانے دھرے رہے

گرد سفر سروں پہ اٹھا کر نکل پڑے
وہ گل کدے وہ آئینہ خانے دھرے رہے

میں بچ گیا کہ سہل نہ جانا حصول رزق
شاید وہ سارے دام وہ دانے دھرے رہے

بہترین خوشبو
دِن بھر تازگی کا احساس
اعلےٰ کوالٹی
مناسب قیمت
رابعہ
بیوٹی کریم
ٹیلکم پاؤڈر
رابعہ پرفیومز
لاہور (پاکستان)

اعلیٰ کوالٹی رُوئی
بہترین کھل
محمد مصطفیٰ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
6۔ کلومیٹر — گوجرہ ۔ موچیوالہ روڈ
گوجرہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)
04651/4377-4682

شارٹ نوٹس طلبی ٹینڈر

محکمہ ہائی وے کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جو سال 1994 - 95 کے لئے اپنے ناموں کا اندراج/ تجدید کرا چکے ہیں درج ذیل کاموں کے لئے آئٹم ریٹس/ فیصد ریٹ ٹینڈر ہر کام کے مقابل درج تاریخ پر بذریعہ ہذا مطلوب ہیں اور حاضر ٹھیکیداروں ان کے با اختیار نمائندگان کی موجودگی میں اسی تاریخ/ وقت پر زیر دستخطی کے دفتر میں کھولے جائیں گے۔

شرائط

1- کوئی ٹینڈر بذریعہ تار فون یا ڈاک قابل قبول نہ ہو گا۔

2- زربیعانہ چالان خزانہ یا کسی شیڈول بینک کی ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں قبول کیا جائے گا جس کے بغیر کوئی ٹینڈر جاری/ قابل قبول نہ ہو گا۔

3- ٹینڈر صرف ان ٹھیکیداروں کو جاری کئے جائیں گے جو خط اندراج/ تجدید سرٹیفکیٹ قومی شناختی کارڈ پیش کریں گے۔ 4- کام کے تفصیلی کوائف یعنی شرائط پلانز ڈرائینگز وغیرہ کسی یوم کار کو زیر دستخطی کے دفتر میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

5- زیر دستخطی کو حق حاصل ہے کہ بلا اظہار وجوہ کسی یا تمام ٹینڈروں کو مسترد کر دیں۔

6- مشروط ٹینڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔

7- ٹینڈر دستاویزات معمول کی ٹینڈر فیس (نا قابل واپسی) کی ادائیگی کر کے ٹینڈروں کے اجرا کی دی گئی تاریخ تک دوران دفتری اوقات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کوئی ٹینڈر وصول کرنے کی تاریخ کو جاری نہیں ہو گا اور ٹھیکیدار ٹینڈر دستاویزات کے تمام صفحات دستخط کرے گا۔

8- فرم/ کمپنی کی صورت میں مختار نامہ کی تصدیق شدہ نقل ٹینڈر کے ساتھ لازماً منسلک کی جائے۔

نام کام	منظور شدہ لاگت	زربیعانہ	میعاد	تاریخ اجرا	تاریخ وصولی
1 ری سرفیسنگ سرگودھا سلانوالی سوبھا براستہ چک 142/ ن ب 166، 167 ن ب ریچ کے ایم 8.70 تا 16.00 = 7.30 کے ایم (فراہمی سامان)	115000	2300	10 یوم	29 3/95	30 3/95
2- ری سرفیسنگ بھیرہ ملک وال روڈ	58000	1160	"	"	"

تفصیل	تخمینہ لاگت	زر ضمانت	مدت		
6.60 تا 7.41، 7.50 تا 7.71، 9.00 تا 9.27، 10.18 تا 11.74، 17.38 تا 17.84، 17.92 تا 18.81 = 4.15 (فراہمی سامان)					
3- ری سرفیسنگ بھیرہ رتو کالا دھوری روڈ کے ایم 7.26 تا 16.00 (فراہمی سامان)	110000	2200	"	"	"
4- ری سرفیسنگ اجنالہ ایم اعظم آباد روڈ کے ایم 0.00 تا 6.00 = 6 کے ایم (فراہمی سامان)	60000	1200	"	"	"
5- ری سرفیسنگ جھنگ ساہیوال سرگودھا روڈ کے ایم 83.00 تا 86.00 = 3.00 کے ایم (فراہمی سامان)	80000	1600	"	"	"
6- ری سرفیسنگ جھنگ ساہیوال سرگودھا روڈ کے ایم 88.40 تا 99.00 = 10.60 کے ایم	1060000	21200	2 ماہ	"	"
7- ری سرفیسنگ لاہور سرگودھا میانوالی روڈ کے ایم 179.83 تا 180.83 اور 182.83 تا 185.33 = 3.50 کے ایم	405000	8100	1 ماہ	"	"
8- ری سرفیسنگ اجنالہ ایم اعظم آباد روڈ کے ایم 6.00 تا 13.20 = 7.20 کے ایم	330000	6600	"	"	"
9- تعمیر چار دیواری ہائی وے سٹور بھلوال بشمول گیٹ	130000	2600	2 ماہ	"	

(رانا محمد فاروق اعظم)
ایگزیکٹو انجینئر
ہائی وے ڈویژن سرگودھا

(IPL-1899-1413-L)

پنجاب ہائی وے ڈیپارٹمنٹ

نوٹس طلبی ٹینڈر

I ۔ مندرجہ ذیل شاہرات کو ہونے والی سیلاب کی تباہ کاریوں کی بحالی کے لئے اے ڈی بی/ کی طرف سے کوفنانسڈ، 1992...... سیلاب کی تباہ کاریوں کی بحالی کے پراجیکٹ کے تحت سی اینڈ ڈبلیو ڈی کے پری کوالیفائیڈ/ منظور شدہ ٹھیکیداروں سے درج ذیل کاموں کے لئے آئٹم ریٹ ٹینڈر مطلوب ہیں۔

سب پروجیکٹ نمبر	نام سب پروجیکٹ	اندازاً مالیت روپوں میں	ملین مدت مہینوں میں	تکمیل تاریخ اجراء/ وصولی
I ۔ ایف اے، پی/ سی اینڈ ڈبلیو14 ۔ 13	I ۔ گجرات سرگودھا روڈ کو ہونے والے سیلاب کے نقصانات کی بحالی	11.950	15ماہ	16.4.95 / 17.4.95

2 ۔ ٹینڈر ' ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے ڈویژن سرگودھا ہر ایک کے مقابل تاریخ کو 1 بجے تک وصول کریں گے اور حاضر ٹینڈر دہندگان یا ان کے با اختیار نمائندوں کی موجودگی میں اسی روز کھولے جائیں گے۔ خواہشمند ٹینڈر دہندگان یا ان کے نمائندگان ٹینڈر ایگزیکٹو انجینئر کو لازماً ذاتی طور پر ڈیلور کریں۔

3 ۔ کوئی ٹینڈر بغیر زر بیعانہ قابل قبول نہ ہو گا۔ زر بیعانہ مالیت ٹینڈر کا 2فیصد کم از کم چالان خزانہ یا کسی شیڈول بینک سے ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں ہر ٹینڈر کے ساتھ منسلک کرنا ضروری ہے اور ہر ایک سر بمہر لفافہ میں جس کے اوپر درج بالا ٹینڈر کا نام ہو اور ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے سرگودھا موسوم کئے جائیں اور کامیاب پیشکش دہندہ کی صورت میں روک لیا جائے گا اور 8فیصد (آٹھ فیصد) سیکورٹی ہر رننگ بل سے وضع کی جائے گی۔

4 ۔ ٹھیکیدار درج ذیل معلومات ٹینڈروں کے ساتھ ارسال کریں

I ۔ مالی اہلیت

II ۔ سڑک کی لمبائیوں کے مطابق گزشتہ کارکردگی

III ایکویپمنٹ اور فنی عملہ کی دستیابی

IV ۔ ٹینڈر صرف ان ٹھیکیداروں کو جاری کئے جائیں گے جو خط اندراج/ تجدید سرٹیفکیٹ قومی شناختی کارڈ پیش کریں گے۔

V ۔ فرم/ کمپنی کی صورت میں مختار نامہ کی تصدیق شدہ نقل ٹینڈروں کے ساتھ منسلک کی جائے

VI ۔ 25لاکھ اور بالا مالیت کے کام کے لئے ٹینڈروں کی بابت صرف ٹھیکیدار مقابلہ میں شرکت کے اہل ہوں گے جو پاکستان انجینئرنگ کونسل کے ہاں رجسٹرڈ ہیں۔ ٹینڈر صرف پاکستان انجینئرنگ کونسل سے جاری کردہ لائسنس پیش

کرنے پر جاری کئے جائیں گے۔

...... ٹینڈر مجوزہ دستاویزات پر دینا ہوں گے جو آئٹم ریٹ ٹینڈر کیلئے تمام اور کاموں کیلئے ...... بک بد شیڈول، عام شرائط کنٹریکٹ اور کنٹریکٹ کا خصوصی پروویژن وغیرہ کی حامل ہیں۔

اے۔	عام شرائط کنٹریکٹ، ہدایات برائے ٹینڈر دہندگان	جلد I
بی۔	عام تصریحات	جلد II
سی۔	سپیشل پروویژنز، بی او کیو اور ڈرائنگز	جلد III

5...... ٹینڈر دستاویزات زر تخمینہ کا 0.025 % (قیمت ٹینڈر) بمطابق کنٹریکٹ پیکنگ ناقابل واپسی کی ادائیگی کر کے متعلقہ ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہر فارم پر -/4 روپے مالیت کے رسیدی ٹکٹ چسپاں کرنا ہوں گے اور دیکھیں کہ ڈویژنل ہیڈ کلرک نے چھید کر کے ضائع کر دیئے ہیں۔ ٹینڈر دستاویزات ٹینڈر کھلنے کے مقررہ دن پر جاری نہیں کی جائیں گی۔

6...... مزید معلومات اور مقداروں کا گوشوارہ حاصل، تفصیلی پلانز اور تصریحات دفتر ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے ڈویژن سرگودھا میں دوران دفتری اوقات کسی یوم کار کو ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

7...... عام شرائط کنٹریکٹ، خاص مندرجات، تصریحات وغیرہ کا ٹینڈر دستاویزات کے مطابق اطلاق ہو گا۔

8...... ٹینڈر کی قبولیت کا اختیار مجاز اتھارٹی کے پاس ہے، جو ٹینڈر منظور کرنے کی پابند نہیں اور اتھارٹی بلا اظہار وجوہ کسی یا تمام ٹینڈروں کو مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

9...... ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے ڈویژن سرگودھا کو حق حاصل ہے کہ اپنا میٹریل ان ریٹس پر جاری کرے جو ان کے دفتر سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

10...... ٹینڈر دہندگان ٹینڈر دستاویزات کا ہر ایک صفحہ دستخط کرے گا اور اس میں تمام درستگیوں پر مختصر دستخط کرے گا۔ ان شرائط کی عدم تعمیل ٹینڈر استرداد کے مستوجب ہو گا۔

11...... ٹھیکیدار جس کا ٹینڈر منظور کر لیا جائے، پیرا بالا میں درج مقررہ ٹینڈر پر معاہدہ کی تکمیل کرنا ہو گی۔ زر بیعانہ پیرا 3 بالا میں درج سیکورٹی کا حصہ تصور ہو گا جو دیکھ بھال کی مدت کے 3 ماہ بعد واپس کر دیا جائے گا۔ مدت دیکھ بھال 12 ماہ ہو گی جو اس وقت سے شمار ہو گی جیسا کہ عام شرائط کنٹریکٹ (جلد-1) میں درج ہے۔

13۔ موبلائزیشن ایڈوانس سرکاری قواعد کے مطابق شیڈول بینک سے بینک گارنٹی کے عوض مالیت کنٹریکٹ کا 10 فیصد کی اجازت دی جائے گی۔

ایگزیکٹو انجینئر

ہائی وے ڈویژن سرگودھا

(IPL-1895-1412-L)

نیا سال مبارک

ترقی کی سمت، آپ کے ہم قدم

الائیڈ بینک کی ایک اور اوّلین پیشکش

پاکستان میں پہلا انٹرنیشنل کریڈٹ کارڈ

زندگی کا اعلیٰ معیار، باسہولت، باوقار

ہر ملک اور ہر سکّہ میں نقد رقم کا نعم البدل "ماسٹر کارڈ" دنیا بھر میں سال ہا سال سے مقبول ہے۔

الائیڈ بینک نے "ماسٹر کارڈ" کے تعاون سے پاکستان میں پہلا انٹرنیشنل کریڈٹ کارڈ" الائیڈ بینک ماسٹر کارڈ" پیش کر کے اپنے کرم فرماؤں کو ایک اور روزمرہ کی سہولت فراہم کردی ہے۔ اب جیب میں ہر وقت نقد رقم رکھنے کی ضرورت نہیں، آپ خریداری اور دیگر ضروریات کے لئے پاکستان سمیت دنیا بھر کے کسی بھی ملک میں "الائیڈ بینک ماسٹر کارڈ" پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

"الائیڈ بینک ماسٹر کارڈ" محفوظ بھی ہے اور باسہولت بھی۔

- آپ چاہے دنیا بھر میں کسی بھی کرنسی میں خریداری کریں۔ الائیڈ بینک کو ادائیگی پاکستانی روپے میں کر سکتے ہیں۔
- "الائیڈ بینک ماسٹر کارڈ" رکھنے والے افراد کو الائیڈ بینک پچاس ہزار روپے مالیت کی پرسنل ایکسیڈنٹ انشورنش کا تحفظ مفت مہیا کرتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے ہماری قریبی شاخ سے رجوع کیجئے

Adarts-ABL-2/94

بہترین ذائقے کی عظیم الشان روایت
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
مفرح پھلوں، مؤثر جڑی بوٹیوں، صحت بخش سبزیوں
اور شاداب پھولوں سے تیار کیا جانے والا
حکمت و مہارت کا شاہ کار، رُوح افزا، جسم و جاں کو گرمی کی
شدت سے محفوظ رکھتا ہے، تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔
مخصوص و منفرد ذائقے اور بے مثال خواص کی
وجہ سے خوش ذوق شائقین کی اوّلین پسند رُوح افزا
- اس صدی کا سب سے بہتر مشروب
رُوحِ ثقافت
رُوح افزا
ہمدرد
مدینۃ الحکمۃ: تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
SHARBAT ROOH AFZA
ADARTS - HRA - 1/94

Monthly ADAB - E - LATIF LAHORE. Regd No. L - 3521
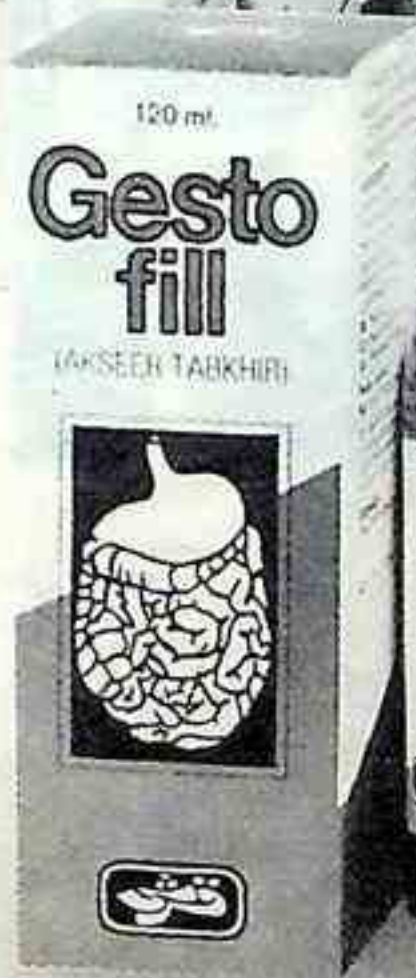
گیسٹوفل
سیرپ
120 ml.
Gesto
fill
(AKSEER TABKHIRI)
• تیزابیت
• گیس
• بدھضمی
میں مفید
تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت

MONTHLY ADAB-E-LATIF LAHORE Regd NO. L. 3521